www.iqbalkalmati.blogspot.com
BOOK HOME
خودکشی
البرٹ کامیو

البرٹ کامیو

ترجمہ: ارشاد احمد مغل

BOOK HOME

THE MYTH OF SISYPHUS

By: Albert Camus

خودکشی

البرٹ کامیو

ترجمہ: ارشاد احمد مغل

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2013ء
قیمت	240 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور پاکستان

فون: 042-37231518-37245072 فیکس: 042-37310854

bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

www.bookhomepublishers.com

فہرست

پیش لفظ

یہ کتاب ہمارے عہد میں خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی فلسفیانہ توضیح پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جو شخص بھی خودکشی کے مظہر کو سمجھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔ یہ کتاب منجھے ہوئے سنجیدہ قاری کو ہی متاثر کر سکتی ہے تاہم نئے قاری کو پڑھنے کے لئے محنت کرنا پڑے گی کیونکہ نیا قاری اپنے کمزور دانشورانہ پس منظر کی وجہ سے بہت سے حوالے سمجھنے سے قاصر رہے گا جن کا اس کتاب میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

(یہ کتاب البرٹ کامیو کی متھ آف سسی فس (سی سی فس کا افسانہ) کا اردو ترجمہ ہے۔) اس کا اردو ترجمہ "خودکشی" کے نام کیا گیا ہے کیونکہ اس میں اسی موضوع کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو زندہ رہنا چاہیے یا خودکشی کرنی چاہیے؟ ایک شخص اس کو انسان کی کہانی بھی کہہ سکتا ہے۔

عام مفہوم میں خودکشی کا مطلب اپنی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں سے ختم کرنا لیا جاتا ہے۔ خودکشی بہت سے وجوہات کی بناء پر کی جاسکتی ہے جن میں ڈپریشن، شرمندگی کا احساس، گنہگار ہونے کا احساس، مایوسی، جسمانی اذیت، ذہنی دباؤ، بے قراری یا بہت سی ایسی وجوہات کی بناء پر خودکشی کی جاتی ہے جن کی خواہش نہیں کی جاتی مگر وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق ہر 40 سیکنڈ کے بعد ایک شخص دنیا میں خودکشی کرتا ہے۔ اس طرح خودکشی کا مسئلہ دنیا کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آرہا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً دو کروڑ کے قریب لوگ ہر سال خودکشی کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو کسی بھی مذہب میں خودکشی کے عمل کو جائز قرار نہیں دیا جاتا تاہم مذاہب میں شہادت کا تصور موجود ہے جس کا جواز بہت مختلف ہے۔ جاپان میں شہادت کی بجائے Sepukku کی گنجائش ہے یعنی ایک ایسی موت جو سیمورائے اپنے لئے منتخب کرتے تھے جس میں اپنے پیٹ کو تلوار کی دھار سے اس طرح چیرا جاتا تھا کہ فوری موت واقع ہو۔ بیسویں صدی میں خودکشی کو بطور احتجاج کے بھی اپنایا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف مقاصد کے لئے خودکش بم دھماکے بھی شامل ہیں جن کو اس زمرے سے باہر نہیں کیا جاسکتا۔ ستی بھی خودکشی کا ایک عمل ہے جس میں خاوند کے مرنے کے بعد بیوی اپنے آپ کو آگ میں جلا لیتی ہے۔

طبی طور پر مرنے کے اختیار کو استعمال کرنے کا عمل ابھی التوا میں ہے جس پر دُنیا نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔

جدید طبی نقطہ نظر کے مطابق خودکشی کی سب سے بڑی وجہ ذہنی بیماری ہے جو بہت سے ایسے نفسیاتی عوامل کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جس کے ذریعے ایک انسان اپنے ڈپریشن، خوف، دکھوں یا ذہنی پریشانی پر قابو پانے کے اہل نہیں ہوتا۔ خودکشی کو ذہن کے ایک ایسے فریم ورک میں ڈھال کر دیکھا جاتا ہے جس میں ایک انسان اپنی مدد کے لئے دوسروں کو پکارتا ہے اور اس کی کوئی نہیں سُنتا یا مکمل مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص خودکشی کرنے کے عمل سے ملتی جلتی کوشش کرتا ہے اور خودکشی نہیں کر پاتا تو ایسے عمل کو خودکشی کی کوشش کہتے ہیں۔

امریکہ میں ایک سروے کے مطابق پچھتر سال سے زیادہ عمر کے مرد حضرات میں خودکشی کے واقعات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اکثر ان مرد حضرات میں موسم بہار اور گرمیوں میں خودکشی کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔

خودکشی کے کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ایک انسان دوسروں کو قتل کرنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو بھی قتل کر لیتا ہے۔ اسے قتل کو خودکشی کہا جاسکتا ہے۔ اس

کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں:

- دوسروں کو قتل کرنے کے لئے خودکشی کرنا جیسے خودکش بم دھماکوں میں ہوتا ہے۔
- دوسرے کسی شخص یا اشخاص کو قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو قتل کرنا تاکہ سزا سے بچا جاسکے۔
- دوسرے کو قتل کرنے کے بعد احساس شرمندگی یا احساس گنہگاری سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو ماردینا۔
- خودکشی اور قتل کرنے کے ملے جلے مقاصد کے ساتھ۔
- ایک شخص کا اہم مقصد خودکشی ہوتا ہے تاہم اپنے بچوں کو دُنیا میں لاوارث چھوڑنے کے خوف اور ڈپریشن سے بچنے کے لئے پہلے اُن کو قتل کرنا اور بعد میں خود قتل ہوجانا۔
- ارادتاً دوسرے کو سزا دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی قتل کرلینا۔
- دوسروں سے انتقام لینے کے لئے پہلے دوسروں کو گولی مارنا اور بعد میں اپنے آپ کو قتل کرلینا۔

تاہم کسی بھی شخص کو قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو قتل کرنا بھی جرم کے زُمرے میں آتا ہے اور اس قسم کا عمل ایسا شخص کرتا ہے جو دوسرے شخص سے اپنے محبوب سے نالاں ہونے یا محروم ہونے کے بعد کرتا ہے۔ ایسا شخص دُنیا کو ایک ایسی خوفناک اور مایوس جگہ سمجھتا ہے جو ایسے لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے جس میں اُن کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس قسم کی فکر کے لئے ایمرجنسی طور پر طبی امداد کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے خودکشی کا عمل کرنے سے پہلے مداخلت ضروری ہوتی ہے۔

چونکہ اکثر خودکشی سے پہلے کا جُرم نتائج کے بغیر ہوتا ہے اور اس کا ادراک کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے اس میں مداخلت کرنا اور ایسے شخص کو طبی امداد فراہم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

خودکشی کی کوشش میں ایک اور قدم اپنے آپ کو زخمی کرنے کا ہوتا ہے۔ اس کو بھی خودکشی کی کوشش کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ دونوں میں ایک ہی چیز مشترک ہوتی ہے وہ ڈپریشن ہے۔

بعض اونچی عمارتیں بھی خودکشی کے لئے مشہور سمجھی جاتی ہیں جہاں سے چھلانگ لگانے کے بعد بچنے کے مواقع بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ دُنیا میں دو ایسے مقام ہیں جن میں ایک سان فرانسسکو میں گولڈن گیٹ برتج ہے اور دوسری جاپان میں اوکی گہارا جنگل (Aokigahara) ہے۔ ایک سروے کے مطابق 2005ء میں گولڈن گیٹ برتج پر سے تقریباً 1200 لوگوں نے جمپ لگایا تھا جب کہ اوکی گہارا جنگل سے 2002ء میں تقریباً 72 لاشیں ملی تھیں۔ ان جگہوں پر خودکشی کے واقعات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ جگہ جگہ پر خودکشی کے لئے سوچنے والوں کے لئے امدادی اداروں کے نشانات پیوست ہیں۔

امریکہ میں 2005ء میں خودکشی کے 52% واقعات آگ جلانے کی وجہ سے رونما ہوئے۔ اس کے علاوہ گلے میں پھندا لٹکانے، زہر کھانے اور ضرورت سے زیادہ دوائی کھانے کے واقعات بھی عام ہیں۔ یہ واقعات تقریباً 42% بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودکشی کے واقعات میں اُونچی جگہ سے چھلانگ لگانا، ٹرین کے آگے جمپ لگانا یا گاڑی کو ٹکرا دینا اور نہر میں چھلانگ لگا دینا بھی ہیں۔

وہ لوگ جو خودکشی کے واقعات میں بچ جاتے ہیں اکثر نفسیاتی ٹروما کا شکار رہتے ہیں۔ اس ٹروما میں خودکشی کا شکار ہونے والے انسان کا گنہگاری کا احساس، ناراضگی، نا اُمیدی، پریشانی اور بیگانگی جیسے جذبات شامل ہوتے ہیں۔ ان پر قابو پانا اس لئے بھی مشکل ہوتا ہے کیونکہ ایسے انسان کے بہت سے سوالات کے جوابات نہیں دیئے جاتے۔

امریکہ میں ہر سال خودکشی کے رویئے سے ہونے والی اموات اور زخموں پر سالانہ 25 بلین امریکی ڈالر رقم خرچ آتی ہے جس میں ہیلتھ کیئر سروس، جنازے پر اُٹھنے والے

اخراجات، تحقیق، autopsies اور دوسری بلواسطہ لاگت شامل ہوتی ہے۔

یہ ترجمہ کئی سالوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ حرف بہ حرف کرنے کی بجائے ویسے کیا جیسے سمجھا اس لئے کئی ناقابلِ فہم حروف حذف کر دیے کیونکہ یہ روانی میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ اس کے ترجمہ میں غلطی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اس کتاب کو سمجھنے اور ترجمہ کرنے کی حوصلہ افزائی ڈاکٹر حامد قزلباش نے کی تھی اس لئے میں اُن کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

ارشاد احمد مغل

خودکشی

میرے خیال میں ''THE MYTH OF SISYPHUS'' میں اُسی تصور کا کھوج لگایا گیا ہے جس کا میری کتاب ''باغی'' میں کھوج لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کتاب میں خودکشی کے پزل کو حل کرنے کی ویسی ہی کوشش ہے جیسی باغی میں قتل کی پہیلی کو بوجھنے کی سعی تھی۔ اس کتاب میں ''کیا زندگی با معنی ہے؟'' جیسے بنیادی موضوع پر بحث کی گئی ہے؟ خودکشی کے مسئلے کا سامنا بڑا اہم ہے۔ یہ موضوع اپنے ہی تضادات میں پنہاں اور عیاں ہوتے ہوئے مختصر جواب دیتا ہے کہ ایسے شخص کے لئے بھی خودکشی جائز نہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتا یعنی دہریے کے لیے بھی خودکشی جائز نہیں ہے۔

1940ء میں فرانسیسی اور یورپی تباہی کے دوران لکھی گئی یہ کتاب دعویٰ کرتی ہے کہ اخلاقیات کے انکاری فلسفے کے اندر ہی اخلاقی حدود تلاش کرنا ممکن ہوتا ہے۔ میں نے آج تک جتنی کتابیں لکھی ہیں اِن میں اسی سمت کی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ خودکشی کا موضوع فانی مسائل کو سامنے لاتا ہے اسی لئے یہ کتاب مایوسی کے صحرا کے وسط میں زندہ رہنے کی دعوت ہے۔

جب سے مجھے اس فلسفیانہ استدلال کا ادراک ہوا تب سے میں نے اس موضوع پر مسلسل لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا رُجحان میری دوسری کتابوں کے حاشیوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اقرار سے انکار کی طرف سفر ایک فنکار اور انسان کے لئے حکمِ الٰہی کے تصور کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ کتاب غور و فکر میں بسی ہوئی ہے جو کبھی سرد اور کبھی گرم جذبات کو مشتعل

کرتی ہے۔ اس میں ایک فنکار تخلیق کرنے اور زندہ رہنے کے استدلال کا عادی نظر آتا ہے۔ پندرہ سالوں کے دوران میں نے بہت سی پوزیشنیں تبدیل کی ہیں جن پر یہاں بحث کی گئی ہے لیکن میں اس موضوع کے ساتھ وفادار رہا۔ یہ موضوع میری ایک ایسی ضرورت بن گیا جس نے مجھے قائل کیا اور مجھے ثابت قدم رہنے پر مجبور کیا۔ اسی وجہ سے یہ کتاب فرانسیسی سے انگریزی میں شائع کی گئی تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے قاری کو بھی اس کا رسیا ہونے کی ضرورت ہے۔

البرٹ کامیو

1955ء، پیرس

فضول استدلال

آنے والے صفحات میں انسان کے ایسے احساسات اور جذبات پر بحث کی جائے گی جو اس کو خودکشی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودکشی کے بارے میں دانشوروں اور فلاسفروں کی بحث کو بھی شامل کیا جائے گا جنہوں نے اس موضوع پر غور وفکر کیا ہے۔ خودکشی اور خودکش دھماکے کرنے والوں میں اگر کوئی بات مشترک ہے تو وہ موت کا شعوری انتخاب ہے۔ تاہم دونوں کے ٹارگٹ میں فرق ہوتا ہے۔ خودکشی کرنے والا اپنے ساتھ ہی اپنی کائنات کو فنا کرنے پر اکتفا کرتا ہے جب کہ خودکش حملہ آور اپنے ساتھ دوسروں کی کائنات کو بھی اندھیرے میں ڈبو دیتا ہے۔ ابتداء سے ہی یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ خودکشی کے لغو خیال سے ہی اس بحث کا آغاز کیا گیا ہے اور اسی خیال کو ہی نقطۂ اختتام سمجھا گیا ہے۔ اس کتاب میں خودکشی کے بارے میں کونسی پوزیشن لی گئی ہے اس کے بارے میں قاری کو وقت سے پہلے ہی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ آخر تک بحث میں شامل رہنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری کتاب میں دانشوروں کا رونا دھونا نظر آئے گا۔ اس میں عقیدے کو بنیاد بناء کر بحث نہیں کی گئی بلکہ اس کے بغیر خودکشی کے پزل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی یہی حدود ہیں۔ میرے ذاتی تجربات نے اس بات کو واضح کرنے کے لئے مجھے مجبور کیا۔

فضولیت اور خودکشی

''زندہ رہنا چاہیے یا خودکشی کرنی چاہیے'' یہ سوال اتنی اہمیت کا حامل ضرور ہے کہ اس

کا دلائل سے جواب دیا جائے۔ یہ ایسی کہانی ہے جسے حل کرنا چاہیے۔ اگر یہ سچ ہے جیسے نٹشے نے دعویٰ کیا تھا کہ ہر خیال "idea" کی وضاحت کرنی چاہیے کیونکہ وضاحت کرنا ہی اصل سچائی ہے تو یقیناً فلاسفر قدر کی نگاہ سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو دل کو بھاتی ہے لیکن عقل پر واضح ہونے سے پہلے اس کا محتاط مطالعہ ضروری ہے۔

اگر میں اپنے آپ سے پوچھوں کہ اس بات کا کیسے فیصلہ کیا جائے کہ پہلے سوال کا جواب فوری دینا چاہیے یا دوسرے سوال کا جواب فوری دینا چاہیے۔ تو میرا جواب ہو سکتا ہے کہ اس کا فیصلہ عمل سے مشروط کرنا چاہیے۔ میں نے کبھی کسی شخص کو دلائل کی خاطر مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گلیلیو انتہائی اہم سائنسی سچائی کا مالک تھا لیکن زندگی کے خطرات دیکھ کر اپنے قول سے منحرف ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اُس نے درست کیا تھا۔ یہ سچائی اتنی بھی قیمتی نہیں تھی کہ اس کی خاطر جان کا ہدیہ پیش کیا جاتا۔ سورج زمین کے گرد گھومے یا زمین سورج کے گرد معمولی سوال تھا۔ سچ ہے یہ ایک بے کار سوال تھا جس کی خاطر زندگی قربان کی جاتی۔ یوں گلیلیو نے اپنی زندگی کو بچا لیا اور اس کی اہمیت کو یقینی بنایا۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ صرف اس لئے جان دے دیتے ہیں کہ اُن کے نزدیک زندگی کی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کئی انقلابی اپنے خیالات پر قائم رہتے ہوئے قتل ہوئے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو اپنی زندگی پر ترجیح دی۔ یوں اس دلیل میں تضاد ہے کہ زندگی اہم ہے یا خیال۔ کیونکہ دونوں کے حق میں ثبوت اور دلائل موجود ہیں۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کے معنی تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس کا جواب کیسے تلاش کیا جائے؟ تمام بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے غور و فکر کے دو بنیادی طریقے تجویز کیے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ وہ ہے جس کے مطابق لوگ اپنے اصولوں کی خاطر موت کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس کے مطابق لوگ زندگی کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی خاطر اصولوں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے حقائق اور شاعری ہے۔ حقائق اور شاعری کے درمیان توازن عقل اور جذبات سے رہنمائی پاتا ہے۔ یہ موضوع عقل کے

ساتھ ساتھ جذبات سے بھی بھرپور ہے۔ اسی وجہ سے علمی اور کلاسیک جدلیت ذہن کے شرمیلے اور چھپے ہوئے رویے کا کھوج لگاتی ہے تاکہ اس کی جڑ کو تلاش کیا جا سکے۔

دراصل خودکشی کو سماجی مظہر کے علاوہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس آغاز سے ہی خودکشی اور انسانی فکر کے درمیان تعلقات کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ خودکشی کا عمل آرٹ کے شاہکار کی طرح خاموشی سے دل میں پیدا ہوتا ہے جس سے خودکشی کرنے والا خود بھی غافل رہتا ہے۔ اچانک ایک شام ٹریگر کھینچتا ہے یا کسی اونچی عمارت سے نیچے جمپ لگا دیتا ہے یا اچانک کسی نہر میں کود جاتا ہے یا زہر کی گولیاں نگل لیتا ہے۔ اخبارات روزانہ ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں جن میں لوگ مختلف وجوہات کی بناء پر اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں تاہم اس میں خودکش دھماکے کرنے والوں کو ابھی تک شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اُن کی منطق اور دلیل سمجھنا علیحدہ معاملہ ہے۔ ایک اپارٹمنٹ کے منیجر نے اپنے آپ کو ایسے ہی قتل کیا تھا۔ اُس کی بچی پانچ سال قبل فوت ہو چکی تھی اس لئے بچی کی وفات کے بعد وہ تبدیل ہو چکا تھا۔ بچی کی موت اُسے اندر سے کھوکھلا کر چکی تھی۔ خودکشی کرنے والے کے لئے ان سے زیادہ درست الفاظ کا انتخاب ممکن نہیں۔ سوچنا اندر سے کھوکھلا کرنا ہے۔ سوسائٹی کو اس قسم کی شروعات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ کیڑا انسان کے دل میں جنم لیتا ہے اس کا حل بھی یہاں ہی تلاش کرنا چاہیے۔ ایک شخص کو اس موذی کھیل کو سمجھنا اور سیکھنا چاہیے جو عقل اور دلائل سے رہنمائی پاتے ہوئے دکھ بھرے تجربات کے ذریعے روشنی سے اندھیرے کی طرف دوڑتا ہے۔

خودکشی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں اور ظاہری وجوہات زیادہ اہم نہیں ہیں۔ غور و فکر کے دوران شاید ہی خودکشی کی گئی ہو۔ جو چیز اس ذہنی بُحران کو نمایاں کرتی ہے جس پر قابو پانے کے لئے ایک انسان اپنی جان کی قربانی دیتا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جس کو لیبارٹری میں پرکھا نہیں جا سکتا۔ اخبارات اکثر اس کی وضاحتیں ''ذاتی دکھوں'' یا ''ناقابلِ علاج بیماری'' یا ''تنگدستی'' کی شکل میں کرتے ہیں۔ یہ وضاحتیں معقول نظر آتی ہیں مگر

حقیقت نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی جاننا چاہیے، کیا خودکشی والے دن اس مایوس شخص کے قریبی دوست نے کہیں اُس سے لاتعلقی کا اظہار تو نہیں کیا تھا یا خودکشی والے دن اُس کو سوسائٹی میں کسی ایک عمل نے مکمل اندھیرے میں تو نہیں دھکیل دیا تھا جس کے بعد خودکشی والے انسان کے لئے کائنات میں صرف اندھیرا تھا اگر ایسا تھا تو ایسا کرنے والے بھی مُجرم ہیں۔ یہ بات بھی اُس کی لاتعلقی کو ہوا دینے اور بیگانگی پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے جب کہ بوریت کو اس میں ابھی تک شامل ہی نہیں کیا گیا (اس میں ایسے خودکشی کے واقعات کو شامل نہیں کیا گیا جن کو سیاسی خودکشی کہا جا سکتا ہے جو اپنے مطالبات منوانے کیلئے کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی خودکشی مقصد کی خاطر ہوتی ہے جب کہ یہاں مقصد کے بغیر خودکشی کے مظہر کو سمجھنے کی کوشش ہے۔)

اِس نازک لمحے کو سمجھنا مشکل ہے جب ذہن موت کا انتخاب کرتا ہے بذاتِ خود اس انتخاب سے وہ نتائج اخذ کرنا آسان ہیں جن پر عمل کیا جاتا ہے۔ جیسا فرضی اور جذباتی ڈراموں میں ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مارنا شہادت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ اقرار کرنا کہ زندگی میں بہت کچھ ہو چکا ہے یا آپ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایک انسان کی باتوں میں اس قسم کے استعارے تلاش کرنے کے لئے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے بلکہ روزمرہ کے الفاظ سے ہی سمجھ لینا چاہیے۔ صرف یہ اقرار کرنا کہ ''اس دکھ کے آگے زندگی بے کار ہے'' خودکشی کی طرف راغب کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کئی وجوہات کی بناء پر مسلسل اشارے کرتے ہیں جن پر زندگی اثر انداز ہوتی ہے جن میں سب سے پہلی وجہ عادت ہے۔ خودکشی کا مطلب جبلی طور پر ہی سہی عادت کے مضحکہ خیز کردار کو تسلیم کرنا ہے جس کے مطابق زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہیں۔ یہی بے مقصدیت مصائب اور روزمرہ کے چڑچڑے پن کو ہوا دیتی ہے یا کہا جا سکتا ہے کہ نمایاں کرتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے بے شمار احساسات ذہن کو نیند سے محروم کر دیتے ہیں جو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں؟ ایک ایسی دُنیا جس کی گڈمڈ دلائل سے وضاحت کی

جاسکتی ہو شناسا دُنیا معلوم ہوتی ہے۔ دوسری طرف روشن دُنیا اچانک انسان کے لئے اجنبی اور پردیسی بن جاتی ہے۔ اس میں انسان کی تنہائی لاعلاج ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بہشت کی اُمید یا گُم گشتہ جنّت کی یادداشت سے محروم ہو چکا ہے۔ انسان اور زندگی کے درمیان جنت کی جدائی اس میں بے سروپا احساسات پیدا کرتی ہے۔ تمام صحت مند انسان خودکشی کے بارے میں ضرور سوچتے ہیں اس لئے کسی خاص تگ و دو کے بغیر ہی انسان کے احساسات اور موت کی آرزو کے درمیان تعلق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اس مضمون کا موضوع اُس درست زاویے کی تلاش ہے جس میں خودکشی کو بے سروپائی کا صحیح حل پیش کیا جاتا ہے۔ خودکشی کرنے والا انسان اپنے یقین کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ یقین کی بنیاد پر عمل کا تعین کرتا ہے۔ زندگی کے بے کار اور بے وقعت ہونے پر یقین انسانی طرز عمل پر حکمرانی کرتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کی بات کرتا ہوں جو خودکشی کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ سادہ مگر پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کو غلط سمجھا گیا ہے کیونکہ سادہ سوال حل کرنے کے لئے ایسے جواب کی ضرورت ہوتی ہے جو سادہ نہیں ہوتا جس میں شہادت کے لئے بھی شہادت درکار ہوتی ہے۔ منطق کے اصول کے مطابق ایک شخص کا اپنے آپ کو قتل کرنے یا نہ کرنے کا مطلب دو فلسفیانہ توضیحات ہوتی ہیں یعنی ''ہاں'' یا ''ناں''۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ جو لوگ 'ناں' میں جواب دیتے ہیں وہ بھی ایسے عمل کرتے ہیں جیسے 'ہاں' کہہ رہے ہوں۔ نٹشے کے مطابق وہ کسی نہ کسی طرح ''ہاں'' کہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں اُن کو زندگی کے بامعنی ہونے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ یہ تضادات مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کو زندہ رہنے کی کبھی اتنی آرزو نہ تھی جتنی اس مقام پر ہے جہاں پر اِن کو منطق عزیز نظر آتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کے فلسفیانہ نظریات اور رویوں کا موازنہ کرنا معمولی سی بات ہے جنھوں نے اس کا اقرار کیا تھا۔ یہ بھی کہنا چاہیے کہ جن مفکرین نے زندگی کو معنی دینے سے انکار کیا تھا اُن میں روسی ادیب کریلو بھی تھا۔ ایک اور روسی ادیب پیری ریگر ینو نے بھی

منطق کو زندگی سے انکار کے مقام تک تسلیم کیا تھا۔ اس نے عوامی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی اور بعد میں خودکشی کرلی تھی تاکہ لوگ اس کو پڑھیں۔ تاہم اس کی کتاب کوئی خاص نہ تھی اس لیے بڑی تعداد میں نہ پڑھی گئی۔ شوپنہاور کا بھی حوالہ دیا جاسکتا ہے جو ایک طرف خودکشی کی تعریف کرتا تھا اور دوسری طرف کرسی پر براجمان ہوتا تھا۔ وہ لطیفہ نہیں سُنا رہا تھا جس کو غیر سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔ ایک المیے کو سنجیدگی کے بغیر لینا تکلیف دہ نہیں تو اور کیا تھا؟ اس قسم کا روّیہ ایک انسان کو سمجھنے میں ضرور مدد دیتا ہے۔ کم از کم ایسا انسان خودکشی کا مذاق اُڑا رہا تھا اور اس کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔

ان تضادات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی کے بارے میں رائے اور عمل کے درمیان کتنا فرق ہے؟ اس سمت میں رائے دینے کے لئے ہمیں زیادہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ انسان کا زندگی کے ساتھ لگاؤ دُنیا کی تمام بیماریوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ جسم ذہن کے فنا ہونے سے فنا ہوجاتا ہے۔ موت کی طرف دھکیلنے والی اس دوڑ میں جسم آہستہ فنا ہوتا جاتا ہے۔ مختصراً اس تضاد کا جوہر اس بات میں مُضمر ہے جسے میں "عقل کو چکرا دینے والا عمل" کہتا ہوں کیونکہ یہ کم وبیش پاسکل کے الفاظ میں ضرور مغالطہ ہے۔ عقل کو چکرا دینے والا عمل غیر تغیر پذیر کھیل ہے۔ عقل کو چکرا دینے والا خاص عمل اور ٹال مٹول مضمون کے ایسے موضوع کی تشکیل کرتے ہیں جسے ہم اُمید کہتے ہیں۔ موت کے بعد خوش حال زندگی کی اُمید کا ایک شخص کو 'مستحق' ہونا چاہیے یا زندہ رہنے والے کو دھوکا دینا چاہیے جو نہ صرف زندگی کے لئے بلکہ اُس عظیم خیال کے لئے زندہ رہتا ہے جو اس سے ماورا ہے اور اسے معنی دیتا ہے۔

غور کیا جائے تو ہر شے بگاڑ میں حصہ ڈالتی ہے۔ لوگوں نے الفاظ کی جادوگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یقین کا بہانہ بنایا کہ زندگی کو معنی دینے سے انکار کرنا لازماً اس اعلان کی طرف لے جاتا ہے کہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں ہے۔ سچ ہے کہ دونوں فیصلوں کے درمیان جانچ کا مشترکہ پیمانہ نہیں ہے۔ صرف ایک شخص کو پہلے سے نشاندہی کیے گئے تضادات،

جدائیوں اور پریشانیوں کے ذریعے گمراہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے سیدھا حقیقی مسئلے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو قتل کرتا ہے کیونکہ زندگی رہنے کے قابل نہیں اور کسی حد تک سچ بھی ہے۔ مگر لا حاصل ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ زندگی کی توہین اس انکار سے ہوتی ہے جس میں یہ غوطہ زن ہے، یہ انکار اُس حقیقت کی بنیاد پر ہے کہ زندگی کے معنی نہیں ہیں ؟ کیا زندگی کی بے وقعتی کا احساس ایک شخص سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اُمید یا خودکشی کے ذریعے اس سے فرار حاصل کرے۔ یہی وہ بات ہے جس کی وضاحت ہونی چاہیے، جس کی شرح کرنی چاہیے۔ کیا زندگی کے بے وقعت ہونے کا احساس موت کا حُکم دیتا ہے؟ اس مسئلے کو دوسرے تمام مسائل پر فوقیت دینی چاہیے۔ معنی میں تبدیلی، تضادات اور نفسیات ذہن میں گھس جاتے ہیں جس میں کوئی اور جستجو اور جنوں جگہ نہیں پاتے۔ یہ ایسی فکر کو دعوت دیتے ہیں جو دوسرے الفاظ میں دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ ہمیشہ دلائل دینا آسان ہوتا ہے لیکن آخر تک دلائل دینا ناممکن ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے ہی ہاتھوں مرتے ہیں ظاہر ہے وہ جذبات کی پیروی کرتے ہیں [اکثر خودکشی کرنے والے نوجوان ہوتے ہیں یا اکثر خود کش دھماکوں میں جان دینے والوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اُن کی عمریں پندرہ سے پچیس سال کے دوران ہوتی ہیں۔ زندگی کے اس حصّے میں انسان استدلالی ہونے کی بجائے زیادہ جذباتی ہوتا ہے۔] خودکشی پر غور و فکر مجھے ایسا موقع دیتا ہے کہ میں اپنی دلچسپی کے ہی مسئلے پر غور کروں یعنی کیا موت کے مقام تک منطق پہنچ سکتی ہے؟ جب تک میں کھوج نہیں لگا تا میں جان نہیں پاتا۔ جنون کے بغیر شہادت کی روشنی میں جس استدلال کا حوالہ دیا جا رہا ہے اسی کو خودکشی کے لئے مجبور کرنے والا استدلال کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی شروعات کی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس کے ساتھ کس حد تک وفا کر سکے۔

جب کارل جیسپر انکشاف کرتا ہے کہ دُنیا کو ایک اکائی بنانا ناممکن ہے تو وہ حقیقت میں دعویٰ کرتا ہے کہ دُنیا کی بطور اکائی تشکیل ناممکن ہے۔ اُس کا یہ کہنا کہ ''یہ حد مجھے میری طرف ہی لاتی ہے، جہاں سے میں مزید معروضی مقام تک واپس نہیں لوٹ سکتا جہاں پر نہ ہی میں

اور نہ ہی دوسرے میری زندگی کا مفعول بن سکتے ہیں" تو وہ اُن خشک صحراؤں کو پکارتا ہے جہاں خیالات زنجیروں میں جکڑے ہوئے پہنچے تھے۔ حقیقت میں ان خیالات میں سے بہت سے وہاں سے نکلنے کا شوق رکھتے تھے۔ جس آخری منزل پر فکر ہچکچاتی ہے وہاں بہت سے لوگ پہنچے تھے جن میں کئی معصوم لوگ تھے۔ وہ اپنی زندگی سے دست بردار ہو گئے تھے۔ علیٰ ہٰذالقیاس دوسرے ذہن کے شہزادوں نے بھی اسے ترک کر دیا لیکن اُنھوں نے اپنی فکر میں خالصتاً بغاوتی شکل میں خودکشی کی شروعات کی تھی۔ جس حد تک ممکن ہو اصل کوشش جنت میں رہنے یا اس جیسی دنیا میں رہنے کا سپنا دیکھنے میں ہے۔ مضبوط اعصاب کے لوگ اس غیر انسانی شو کے تماشائی ہیں جس میں خودکشی، اُمید اور موت کا مکالمہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح ذہن ان کو واضح کرنے اور خودکشی سے نجات دلانے سے پہلے اس پُر اسرار رقص کی ظاہری شکل کا تجزیہ کرتا ہے۔

فضول بندشیں

عظیم فن پاروں کی طرح احساسات وہ ہوتے ہیں جن کا اظہار نہیں کیا جا سکتا (یہ تجریدی آرٹ کی طرح ہوتے ہیں جن کو اشاروں کنایوں اور رنگوں کے امتزاج سے سمجھنا پڑتا ہے)۔ ایک انسان کے ذہن میں دُکھوں اور پچھتاوے کی مسلسل فکر اور عمل کے درمیان مُڈبھیڑ ہوتی رہتی ہے۔ یہ مُڈبھیڑ تب ہوتی ہے جب خود روح بھی اس کے بارے میں لاعلم ہوتی ہے۔ عظیم احساسات اپنے ساتھ حقیر یا عظیم کائنات لاتے ہیں۔ ایک مخصوص دُنیا میں وہ اپنے ہی جنوں سے جگمگاتے اور اپنے ہی موسم میں بُجھ جاتے ہیں۔ کائنات حسد، ہمت، خود غرضی اور سخاوت سے بھرپور ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ذہنی رویے اور الٰہیات کی کائنات ہے۔ پہلے سے ہی مخصوص احساسات کے لئے سچائی وہ جذبات ہیں جو بُنیادی طور پر غیر متعین کردہ ہونے کے ساتھ ساتھ مبہم اور واضح، قریب اور دور موجود ہیں جو لوگوں کو خوبصورتی سے آراستہ کرتے یا لغویت سے روشن کرتے ہیں۔

کسی بھی چورا ہے پر یہ احساس ''کہ زندگی بیکار ہے۔'' اس کے بے کار ہونے کا خیال ایک شخص کے منہ پر طمانچہ مار سکتا ہے اور اس کو اُداس کر سکتا ہے۔ یہ تکلیف دہ خیال اندھیرے میں نُور کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ غور وفکر کا مستحق ہے۔ایک انسان دوسرے انسان کے لئے ہمیشہ گمنام رہتا ہے اور اُس میں کوئی شے ایسی ضرور ہوتی ہے جو ناقابلِ ادراک ہوتی ہے۔ یہی چیز اسے فرار میں مدد دیتی ہے۔ عملی طور پر میں انسانوں کو جانتا ہوں اور اُن کے رویّوں سے اُن کو پہچان سکتا ہوں، میں اُن کے اعمال سے، اُن کی موجودگی سے زندگی میں پیدا ہونے والے نتائج کے ذریعے جانتا ہوں۔تمام غیر استدلالی احساسات تجزیہ کی دعوت نہیں دیتے۔ اسی لئے میں اُن کا عملی طور پر تعین کر سکتا ہوں، میں اُن کو عملی طور پر سراہ سکتا ہوں، میں اُن کے نتائج اکٹھے کرنے اور اُن کی ذات کے تمام پہلوؤں کو نوٹ کرنے کے بعد اُن کی دُنیا کا خاکہ کھینچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر ان کا سینکڑوں دفعہ مطالعہ کیا ہے لیکن میں ذاتی طور پر ان کو زیادہ نہیں جانتا۔ اگر میں ان کے سورماؤں کو جمع کروں اور ان کا مطالعہ کروں یا اگر میں یہ کہہ سکوں کہ میں اُنھیں تھوڑا سا زیادہ جانتا ہوں تو اس میں کسی حد تک سچائی ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ایک انسان کا تعین اس کے عقائد اور ہیجانات کے ذریعے ہوتا ہے۔اس میں احساسات کا تنزل ہوتا ہے لیکن ہماری اس کے دل تک رسائی نہیں ہوتی لیکن اُس کا عمل احساسات کو عیاں کرتا ہے کیونکہ ذہن ایک مخصوص رویے کا اظہار کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح ایک طریقے کا تعین کیا جاتا ہے جو علم کی بجائے تجزیہ ہوتا ہے۔ کیونکہ طریقے مابعد الطبیعات کو لاگو کرتے ہیں اور لاشعوری طور پر ایسے نتائج سامنے لاتے ہیں جن کا اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اس سے ابھی تک لاعلم ہے۔ کتاب کے آخری صفحات شروع کے صفحات پر مشتمل ہو جاتے ہیں۔ ایسا تعلق ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر تعین کردہ طریقہ کار احساس کو تسلیم کرتا ہے کہ سچا علم ناممکن ہے۔ صرف ظاہریت کو شمار کیا جاتا ہے اور موسم محسوسات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

شاید ہم ذہانت کی لغو دُنیا کے چکرا دینے والے احساس کو پکڑنے کے قابل ہو سکیں جو

لاتعلق دُنیا سے جڑا ہوتا ہے یعنی وہ ذہن جو زندہ رہنے کے آرٹ یا بذاتِ خود آرٹ سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی انداز سے خودکشی کے موسم کی شروعات ہوتی ہے۔ جس کا اختتام خودکشی پر ہوتا ہے اور ذہن دُنیا کو اس کے سچے رنگوں سے روشن کرتا ہے تاکہ اس کی بے رحم شکل کو ظاہر کر سکے جس کا ادراک کیا گیا تھا۔

تمام عظیم مُہمات اور افکار کی شروعات فضول خیالات سے ہوتی ہے۔ اکثر عظیم کارنامے ہوٹلوں کے دروازوں یا سڑکوں کے چوراہوں پر پیدا ہوئے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا کی بُلندی اور عظمت کی پیدائش حقیر ہوتی ہے۔ بعض اوقات جب کسی سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے تو اُس کا یہ جواب کہ 'کچھ بھی نہیں سوچ رہا' کے بارے میں ہم خیال کر سکتے ہیں کہ جواب دینے والا بہانہ بنا رہا ہے۔ محبت کے روگی اس جواب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر یہ جواب خلوص پر مبنی ہو تو یہ روح کی اُس انوکھی حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں انسان کا ذہن ایک مبلغ کی طرح تقریر کرتا رہتا ہے اور اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے جس میں روزانہ کے اشارات کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے، جس میں دل خودنمائی سے ایسا تعلق تلاش کرتا ہے جو اس کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یہ پھر ویسے ہو جائے جیسے پہلی نظر میں تھا۔ خودکشی کے رُجحان کے یہ ابتدائی نشانات ہیں۔

خیالات کے اس تلاطم سے ایسے لگتا ہے جیسے پورا منظر اچانک دھڑام سے گر گیا ہو۔ صُبح اُٹھنا، گاڑی پکڑنا، فیکٹری یا دفتر میں آٹھ گھنٹے گزارنا، کھانا کھانا، گاڑی پکڑنا، چار گھنٹے کام کرنا، کھانا کھانا، سو جانا اور سوموار، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار کا ایک ہی ردھم۔ ایک ہی راستے پر چلنے کے دوران ایک دن 'کیوں' سر اُٹھاتی ہے۔ پریشانی پیدا کرنے والی اس کیوں سے شروع ہونے والی ہر شے حیرت سے رنگین ہو جاتی ہے۔ 'شروع ہونا' اہم ہے۔ پریشانی کسی بھی میکانکی عمل کے آخر میں وارد ہو سکتی ہے لیکن ساتھ ہی شعوری بیداری کا باعث بھی بنتی ہے۔ یہ شعور کو اُبھارتی اور مشتعل کرتی ہے جو اس کی پیروی کرتا

ہے۔شعور پریشانی کی اطاعت کرتا ہے جو غیر مشروط طور پر بیدار ہوتی ہے۔ بیداری کے آخر میں عین وقت پر نتیجہ سامنے آتا ہے یعنی خودکشی کی جائے یا زندہ رہا جائے۔ ایسے لگتا ہے جیسے پریشانی کے اندر ہی بے زاری چھپی ہوتی ہے۔ میں اس کا خلاصہ کرتا ہوں کہ یہ اچھی بات ہے۔ ہر شے کا آغاز شعور سے ہوتا ہے۔اس کے بعد کوئی شے بھی قابلِ وقعت نہیں رہتی۔تھوڑی دیر کے لئے اس لغویت کی ابتداء میں سرسری سا غور ہی کافی ہوتا ہے۔ ہیڈیگر کے نزدیک صرف ''اضطراب'' ہی ہر شے کا سرچشمہ ہے۔

جب ہم گمنام ہوتے ہیں تو ہر روز وقت ہمیں بہاتا ہے۔لیکن ایک مقام ایسا آتا ہے جب ہمیں وقت کو اپنے ساتھ بہانا پڑتا ہے[یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں شعور بیدار ہوتا ہے اور اپنے آپ پر فوکس کرتا ہے۔] ہم مستقبل پر زندہ رہتے ہیں یعنی ''کل''، ''پرسوں''، ''جب آپ اپنا راستہ تلاش کرو گے''، ''آپ سمجھ جاؤ گے جب بوڑھے ہوں گے''۔اس قسم کی بے تکی باتیں بڑی اہم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں موت کا ذکر کیا جاتا ہے۔تاہم ایک مقام ایسا آتا ہے جب انسان رُک کر جائزہ لیتا ہے یا اپنے آپ سے کہتا ہے کہ وہ تیس سال کا ہو چکا ہے۔ وہ اپنی جوانی کو جتاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو وقت کے اندر پاتا ہے۔وہ اس میں اپنی جگہ پالیتا ہے۔وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ اس خم دار لکیر کے مخصوص نقطے پر کھڑا ہے جس پر سفر کرتے ہوئے اُسے اختتام تک پہنچنا ہے۔ وہ وقت کی ملکیت بن جاتا ہے اور دہشت اُس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ وہ پہچان لیتا ہے کہ وقت اُس کا بدترین دُشمن ہے۔کل وہ کل کی آرزو کر رہا تھا جب کہ اس کے اندر ہر شے اُسے رد کر رہی تھی۔جسم کی بغاوت لغو نظر آتی ہے۔(اس کا ذہن اردگرد کی دنیا میں تمام دلکش مناظر کو رد کر دیتا ہے۔اس بیداری کے ساتھ ہر شے پھیکے پن کا سبب بنتی ہے۔ یوں انسان پر اداسی اور حُزن چھا جاتا ہے۔)

ایک قدم آگے انسان میں اجنبیت رینگتی ہوئی داخل ہوتی ہے یعنی یہ ادراک کرنا کہ دُنیا 'ٹھوس' ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ پتھر کتنے اجنبی ہیں اور کس شدت کے ساتھ فطرت یا

اردگرد کے مناظر اس کی 'نفی' کر رہے ہیں۔ ہر خوبصورتی کے قلب میں غیر انسانی شے مُضمر ہوتی ہے۔ یہ پہاڑیاں، یہ آسمان ، یہ درخت جس کے اندر ہم ملبوس ہیں گُم گشتہ جنّت سے بھی زیادہ دور معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کے ساتھ دُنیا کی ہزار سالہ قدیم دُشمنی سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے ہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ صدیوں تک ہم نے اس کی صرف شکلوں اور ڈیزائنوں کو سمجھا ہے۔ ہم پہلے سے اِن سے منسوب تھے کیونکہ ہم اس حکمتِ عملی کو اپنے لئے استعمال کرنے کی قوت سے محروم تھے۔ دُنیا ہم سے پہلو تہی کرتی ہے کیونکہ یہ دوبارہ اپنے آپ کو بنا لیتی ہے۔ عادت کا نقاب اوڑھے ڈرامے کا منظر دوبارہ وہی بن جاتا ہے جو حقیقت میں تھا۔ جو ہم سے فاصلے پر ہی دست بردار ہو جاتا ہے۔ ایسا دن بھی آتا ہے جب اُس عورت کو ہم اجنبی نظر آتے ہیں جس سے ہم کچھ مہینوں یا سالوں قبل محبت کرتے تھے۔ شاید ہم نے اس کی خواہش کی ہوگی جس نے ہمیں اچانک تنہا کر دیا تھا۔ اس طرح اس کی خواہش ہمارے اجنبی پن کو کم کرنے کی بجائے بڑھاتی ہے۔

انسان بھی غیر انسانیت کا راز ہے۔ وضاحت کے خاص لمحات میں، اشارات کے میکانکی پہلو بے کار تماشے کی ہر شے کو احمقانہ بنا دیتے ہیں جس میں انسان گھرا ہوتا ہے۔ ایک انسان شیشے کی دیوار کے پیچھے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ آپ اُسے سُن نہیں سکتے لیکن اُس کی نا قابلِ فہم گفتگو دیکھ سکتے ہیں۔ آپ حیران ہیں کہ وہ زندہ کیوں ہے۔ ایک انسان کی اپنی ہی غیر انسانیت کے سامنے پریشانی ایسی صورت میں نا قابلِ فہم ہل چل مچا دیتی ہے جسے آج کا مصنف 'متلی' کہتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اجنبی جو ہمیں اس مخصوص لمحے شیشے کے پیچھے ملنے آتا ہے وہ شناسا لیکن چونکا دینے والا شخص جس کی ہم نے شیشے میں تصویر کا سامنا کیا تھا وہ بھی لغو معلوم ہوتا ہے۔

اب میں اُس رویے کی طرف آتا ہوں جس کی طرف ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اس مقام تک دُکھوں سے بچنے کے لئے موت ہی مناسب حل نظر آتا تھا۔ ایک شخص یہ جان کر حیران نہیں ہوتا کہ سب لوگ دُنیا میں ایسے رہتے ہیں جیسے اُنھیں کوئی نہیں 'جانتا'۔ ایسا

صرف اس لئے ہوتا ہے کیونکہ حقیقت میں کسی کو موت کا تجربہ نہیں ہوا۔ جو زندگی شعوری طور پر گزاری جاتی ہے اس کے علاوہ دوسری زندگی اندھیرے پر مشتمل ہوتی ہے کیونکہ زندگی کا یہ حصہ ادراک سے خالی ہوتا ہے۔ مشکل سے ہی یہاں پر دوسروں کی 'موت' کے تجربات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک متبادل ہے ایک دھوکا ہے جو ہمیں قائل نہیں کر سکتا۔ سوگوار اجتماع کبھی خودکشی کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ حقیقت میں اس واقعہ پر سوچ بچار سے دہشت وارد ہوتی ہے۔ وقت ہمیں خوفزدہ کر سکتا ہے کیونکہ اس سے مسئلہ نظر آتا ہے اور اس کے بعد حل کرنے کی باری آتی ہے۔ روح کے بارے میں خوبصورت تقریریں کم از کم وقتی طور پر قائل کرتی ہیں۔ جس غیر متحرک جسم پر تھپڑ نشان نہیں چھوڑتا اس میں روح غائب ہو جاتی ہے۔ مُہم کا یہ بُنیادی اور حتمی پہلو بے سروپا احساس کی تشکیل کرتا ہے۔ تقدیر کی موذی روشنی میں اس کی فضولیت ہو جاتی ہے۔ اخلاقیات کا کوئی بھی کوڈ اور کوشش اس ظالمانہ حساب کتاب کے سامنے علت اور معلول کی منطق کو جائز نہیں سمجھتی جو ہماری حالت کا حکم صادر کرتی ہے۔

میں اب تیزی سے موضوع بحث کی تقسیم بندی کرتا ہوں اور واضح موضوعات کی نشاندہی کرتا ہوں۔ فلسفے اور ادب میں ان کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر روز ان پر بحث ہوتی ہے۔ ان کو دوبارہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان حقائق کے بارے میں یقین ہونا ضروری ہے تاکہ ایک شخص آگے جا کر بنیادی سوال اُٹھا سکے۔ مجھے ایک دفعہ پھر کہنے دیں کہ میں بے سروپا دریافتوں میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی ان کے نتائج میں رکھتا ہوں۔ اگر ایک شخص ان حقائق سے مطمئن ہے تو نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ ایک شخص جتنا بھی دور ہو عدم کے خطرے سے بچے؟ کیا ایک شخص کو خودکشی کرنی چاہیے یا ہر شے کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُمید کرنی چاہیے؟ اس کا فوری مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کو سمجھنا چاہیے۔

ذہن کا پہلا کام سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کرنا ہے۔ جیسے ہی ذہن اپنے آپ پر غور کرتا ہے سب سے پہلے تضادات دریافت کرتا ہے۔ ایسی حالت میں ذہن کو قائل کرنے

کی کوشش بے کار ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ارسطو نے صدیوں پہلے ذہن کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی جب اس نے کہا تھا، ''اکثر عقائد کے لغو نتائج ہی اس کو تباہ کرتے ہیں۔'' یہ دعویٰ کرنا کہ سب کچھ درست ہے جھوٹ کو واضح کرتا ہے۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ سب کچھ جھوٹ ہے تو یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ میرے دعویٰ کے خلاف سب کچھ غلط ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ ہم بے شمار جھوٹ یا سچ کی جھمٹوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص سچے دعویٰ کا اظہار کرتے ہوئے ایک ہی ساتھ سچ کا بھی اعلان کر سکتا ہے۔

منطق کا یہ منحوس چکر اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں سوچنے والا ذہن چکرا جاتا ہے۔ عقائد کی سادگی ہی اِن کو مٹا سکتی ہے۔ الفاظ کا جیسا بھی کھیل کھیلا جائے یا منطق کی جتنی بھی جادوگری کی جائے سب سے اہم بات تضادات کو مٹانا ہے۔ ذہن کی سب سے گہری آرزو انسان کے لاشعوری احساسات کے مساوی ہوتی ہے یعنی اس کا بے تکلفی پر اصرار اور وضاحت کی آرزو ہو سکتی ہے۔ انسان کی دُنیا کو سمجھنا اسے انسان تک محدود کرنا اور اس پر مہر لگا کر سیل بند کرنا ہے۔ بلّی کی کائنات چیونٹیوں کی کائنات سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 'پوری فکر استعاروں کے علاوہ معنی نہیں رکھتی'۔ جو ذہن حقیقت سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہے اپنے آپ کو فکر کی اصطلاحات تک محدود کرنے سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر انسان سمجھ لیتا کہ کائنات بھی انسان کی طرح محبت کرتی اور دُکھ جھیلتی ہے تو کائنات کے ساتھ سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔ اگر فکر رونما ہونے والے واقعات کے ٹمٹماتے شیشوں میں خدائی تعلقات دریافت کرتی جو اپنے آپ کو ایک اصول میں سمونے کے اہل ہوتے تو ایک طرح کی دانشورانہ مُسرت کا تجربہ ہو سکتا تھا جس میں فیض حاصل کرنے والے کی داستان مضحکہ خیز نقل کے علاوہ کچھ نہ ہوتی۔ ایک ہو جانے کا روگ اور خُدا بننے کی بھوک انسان کے لئے ناگزیر قوتِ محرکہ ہے۔ تاہم اس روگ کا وجود اس حقیقت پر لاگو نہیں ہوتا کہ اس کی فوری تائید ہونی چاہیے۔ اگر ہم پرمیدیز اس [Permenides] کے حقیقت کے ایک ہونے کے دعویٰ کی تائید کریں تو ہم ذہن کے بے سروپا تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں جو کُلی وحدت کو

جتاتا ہے اور اپنے ہی تضادات پر زور دیتا ہے جس کو حل کرنے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ یہ دوسرا منحوس چکر ہماری اُمیدوں کو خاک میں ملانے کے لئے کافی ہے۔

یہ مسلمہ سچائیاں ہیں۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے بلکہ اُن نتائج میں دلچسپی ہے جن کو ان سچائیوں کے ب بے نقاب کرنے سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک اور مسلمہ حقیقت کو جانتا ہوں جو بتاتی ہے کہ انسان فانی ہے۔ ایک شخص اُن دانشوروں کو شمار کرسکتا ہے جنھوں نے انتہاپسندانہ نتائج اخذ کیے تھے۔ اس مضمون میں اس کو مستقل ''پوائنٹ آف ریفرنس'' کے طور پر لینا ضروری ہے۔ جس کو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اور ہمیں اپنی سچائیوں کے ساتھ زندہ رہنے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ذہن کے اس ناقابلِ حل تضاد کا سامنا کرتے ہوئے ہم اپنی ہی تخلیق سے جدائی کو کلی طور پر اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ جب تک ذہن اُمیدوں کی ساکت دُنیا میں خاموش رہتا ہے تب تک اس میں ہر چیز کا عکس دیکھتا ہے اور واپس لوٹ جانے کے روگ میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن اس کی پہلی ہی چال سے دُنیا میں شگاف پڑجاتے ہیں اور دُنیا سر کے بل گھوم جاتی ہے یعنی مایوسی کے لامحدود ٹمٹماتے ٹکڑے فہم کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کے لئے اُس شناسا اور پُرسکون دُنیا سے مایوس ہوجاتے ہیں جو ہمارے قلب کو سکون فراہم کرتی تھی۔ صدیوں کی تحقیق کے بعد دانشور جدائی کے مفہوم سے آگاہ ہوئے جو ہمارے علم کے لئے سچ ہے۔ فلاسفروں کے علاوہ تمام لوگ سچے علم سے مایوس ہیں۔ اگر صرف انسانی فکر کی تاریخ کے اہم واقعات رقم کیے جائیں تو اس میں انسان کے پچھتاوں اور کوتاہیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

درحقیقت میں کسی سے کیا کہہ سکتا ہوں، میں جانتا ہوں! میں اپنے اندر اس دل کو محسوس کرسکتا ہوں اور جان سکتا ہوں کہ یہ زندہ ہے۔ اس دُنیا کو میں چھوسکتا ہوں اور فیصلہ کر سکتا ہوں کہ یہ موجود ہے۔ میرا علم یہاں پر ختم ہوجاتا ہے اور بناوٹ رہ جاتی ہے۔ اگر میں اس ذات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہوں، اگر میں اس کو محسوس کرتا اور اس کا خلاصہ کرتا ہوں تو اسکا تعین کرتا ہوں کہ دُنیا میرے ہاتھوں کی انگلیوں سے ایسے سرک رہی

ہے جیسے انگلیوں سے پانی سرکتا ہے۔ میں ایک ایک کر کے تمام پہلوؤں کا خاکہ کھینچ سکتا ہوں جس کو میں فرض کرسکتا ہوں کہ وہ اس پرورش، ظہور، خوشبو، خاموشی، کمینگی اور شرافت سے منسوب ہے۔ ان پہلوؤں میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرا دل میرے ہی لئے ہمیشہ ناقابلِ تعین رہتا ہے۔ میں اپنے وجود اور مقصد کے درمیان یقین کو پختہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ خلیج کبھی پُر نہیں ہوتی۔ میں ہمیشہ اپنے آپ سے اجنبی رہتا ہوں۔ منطق کی طرح نفسیات میں بھی سچ کے علاوہ کوئی سچ نہیں ہے۔ سقراط کا اصول کہ 'اپنے آپ کو جانو' کی اُتنی ہی قدر ہے جتنی آج کے اعترافِ گناہ کرنے والوں کے نزدیک 'نیک بنو' کی قدر ہے۔ یہ قدر ایک ہی لمحے میں جہالت کے ساتھ ساتھ موت کے روگ کو عیاں کرتی ہے۔ یہ عظیم مضامین پر بے نتیجہ مباحثے ہیں یہ تبھی جائز ہو سکتے ہیں جب ان کا جائزہ لیا جائے یا ان کو پرکھا جائے۔

یہ درخت ہیں اور میں اِن کی کُھردری سطح کو جانتا ہوں۔ میں پانی کے ذائقہ کو چکھ سکتا ہوں۔ میں رات کے ستاروں، گھاس کی خوشبو اور سہانی شاموں میں راحت محسوس کرتا ہوں۔ میں اس دُنیا سے کیسے انکار کرسکتا ہوں جس کی قوت اور طاقت محسوس کرتا ہوں؟ اس کے باوجود زمین پر تمام علوم مجھے یقین دہانی کے لئے کوئی ایسا جواز فراہم نہیں کرتے جن سے میں یقین کرسکوں کہ یہ دُنیا میری ہے۔ آپ اسکی شرح کرتے ہیں اور مجھے اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔ آپ اِس کے قوانین گنواتے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سچ ہیں۔ آپ اِس کے میکانزم کو الگ الگ کرتے ہیں اور میری اُمید بندھ جاتی ہے۔ آخر میں آپ مجھے پڑھاتے ہیں کہ اس حیران کُن اور رنگوں بھری کائنات کو ایک ایٹم تک گھٹایا جا سکتا ہے اور ایٹم کو بذاتِ خود الیکٹرون تک گھٹایا جا سکتا ہے۔ یہ سب سچائیاں ہیں اور میں آپ کا منتظر ہوں کہ ان کی تفصیل بتاتے جائیں۔ آپ مجھے نظر نہ آنے والے سیاروی نظام کے بارے میں بتاتے ہیں جس میں الیکٹرون نیوکلیس کی کشش سے گردش کرتے ہیں۔ آپ دُنیا کی ایک شکل کے ذریعے وضاحت کرتے ہیں۔ تب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعری تک

محدود ہیں یعنی میں کبھی نہیں جان پاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے۔ کیا اس مقام پر مجھے افسوس ہونا چاہیے اور مایوس ہو جانا چاہیے۔ آپ نے پہلے ہی نظریات تبدیل کر لئے ہیں؟ جس علم سے مجھے سب کچھ سکھایا جا رہا تھا مفروضے پر ختم ہو جاتا ہے سچائی کے متلاشی شاعری میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں اور غیر یقینی صورتِ حال کو آرٹ کے کام میں حل کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اتنی کاوش کی کیا ضرورت تھی؟ ان پہاڑیوں کی نرم لکیروں اور اس بے چین دل پر شام کا منظر مجھے اس سے زیادہ سکھا سکتا تھا۔ میں اپنے آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہوں۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ اگر سائنس کے ذریعے اس مظہر کو گرفت میں لیا جا سکتا اور اس کو شمار کیا جا سکتا تب بھی میں اِس دُنیا کا ادراک نہ کر سکتا۔ کیا مجھے اس سے نجات کا کھوج لگانا چاہیے اور زیادہ نہیں جاننا چاہیے؟ آپ مجھے اس تفصیل کے درمیان انتخاب کا اختیار دیتے ہو جو یقینی ہے لیکن میں عدم اور مفروضات سے سیکھتا ہوں لیکن ایسا یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی ذات اور دُنیا سے اجنبیت ایک ایسی فکر سے مسلح ہے جو اپنے آپ کا اُسی وقت انکار کرتی ہے جس وقت اس کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ کونسی شرط ہے جس میں مزید زندہ رہنے اور جاننے سے انکار کرنے پر ہی زندگی پُر سکون ہو سکتی ہے، جس میں فتح کی اِشتہا دیواروں سے ٹکراتی ہے اور اس کے حملوں کا مقابلہ کرتی ہے؟ ارادہ کرنا عقائد کو بھڑکانا ہے۔ ہر چیز کا حکم اس طرح ہے جس طرح زہر آلودہ سکون وجود میں آتا ہے جو بے فکرے دل کی غیر موجودگی یا موذی دست برداری کے ذریعے پیدا ہوتا ہو۔

میری عقل مجھے سکھاتی ہے کہ دُنیا فضول ہے۔ اس کے برعکس یقین دعویٰ کرتا ہے کہ دُنیا بامقصد ہے۔ میں ثبوت کا انتظار کرتا ہوں اور اس کے درست ہونے کی خواہش کرتا ہوں۔ لیکن صدیوں پر محیط بناوٹی غور و فکر اور فصیح و بلیغ انسانوں کے بھروسے پر میں جانتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہو سکا ہے تو کم از کم یہ ضرور جان سکا ہوں کہ اس خطے میں خوشی نہیں ہے۔ یہ عالمی سچائی ہر چیز کی وضاحت کرتی ہے۔ ایک معقول انسان کو مُسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ اس کی جید سچائی سے انکار کرتی ہے جس کو پابہ جولاں ہونا

چاہیے تھا۔ اس ناقابلِ فہم اور محدود کائنات میں انسان کی قسمت کا معنی فرض ہے۔ عقائد کا انبوہ اُمڈ پڑتا ہے اور اس کو موت تک گھیرے رکھتا ہے۔ اس کی واضح سمجھ بوجھ کو بحال کرنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد فضول احساسات دوبارہ واضح اور اٹل ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ دُنیا فضول ہے لیکن میں نے جلد بازی میں کہا تھا۔ یہ دُنیا بذاتِ خود معقول نہیں اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ جو کچھ فضول ہے وہ عقیدے سے تصادم چاہتا ہے جس کا بلاوا انسانی دل میں گونجتا ہے۔ فضولیت انسان پر بھی اُتنی ہی منحصر ہے جتنی دُنیا پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لمحے یہ ایک دوسرے کو جوڑتی ہے۔ یہ اِن کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے باندھتی ہیں جیسے نفرت دو مخلوقوں کو ایک دوسرے سے ویلڈ کر دیتی ہے۔ میں اس ناقابلِ پیمائش دُنیا میں صرف یہی انکشاف کر سکتا ہوں۔ اب میں ایک لمحے کے لئے غور و فکر کرتا ہوں۔ اگر مجھے سچائی کے ساتھ چمٹنا ہے تو لغویت ہی میرے تعلقات کا تعین کرتی ہے۔ اگر میں اس کے جذبات سے لبریز ہوتا ہوں تو یہ مجھے دُنیا کے سامنے اپنی گرفت میں لیتی ہے، سائنس کی تلاش میں فہم مجھ پر حاوی ہو جاتا ہے اس لئے مجھے ان سچائیوں کی خاطر ہر شے قربان کرنا پڑتی ہے اور مجھے اِن کو برقرار رکھنے کے لئے چاروں طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ سب سے بالاتر ان کی خاطر مجھے اپنے رویے کو تبدیل کرنا پڑتا ہے اور اُن کا نتائج تک پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ میں وقت سے پہلے جاننا چاہتا ہوں کیا فکر اِن صحراؤں میں زندہ رہ سکتی ہے؟

میں پہلے ہی جانتا ہوں کہ کم از کم فکر ایسے صحرا میں داخل ہو چکی ہے جہاں اس کو اپنا رزق تلاش کرنا ہے۔ یہاں ہی میں جان سکتا ہوں کہ اس کا پہلے ہی توہمات کے ذریعے پیٹ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ہی یہ انسانی غور و فکر کیلئے ناگزیر موضوعات کی تائید کرتی ہے۔

جیسے ہی لغویت کی نشاندہی ہوتی ہے یہ جنوں بن جاتی ہے اور یہی سب سے زیادہ دل خراش بات ہے۔ ایک شخص اپنے ذہنی اضطراب کے ساتھ زندہ رہے یا نہ رہے، ان قوانین

کو قبول کرے یا نہ کرے، جو دل جلاتے ہیں، وہ ان کا معیار ضرور بلند کر سکتا ہے اور یہی بنیادی سوال ہے۔ یہ وہ سوال نہیں جس کا ہمیں ابھی جواب چاہیے۔ یہ اس تجربے کے قلب میں کھڑا ہے۔ اِس کی طرف واپس لوٹنے کا وقت آئے گا۔ اس کی بجائے اُن موضوعات اور قوتِ محرکہ کو تسلیم کرنا پڑے گا جو صحرا کی پیدائش ہیں۔ ان کو شمار کرنا ہی کافی ہوگا۔ آج بھی یہ ہم پر عیاں ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو عقائد کا دفاع کرتے ہیں۔ عقلیت پرستی پر اتنی تنقید کی گئی کہ اس پر بات کرنا بے کار ہے۔ تاہم ہمارا عہد اُن عقائد کے ذریعے اُبھرا ہے جو استدلال کی بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک طرح اُمید ہی عقل کی کارگری کا ثبوت نہیں ہے۔ تاریخ کی ہموار سطح پر اس طرح کے دوہرے رویے کی ثابت قدمی انسان کے ناگزیر جذبۂ محبت کی شرح کرتی ہے جو اُس کے اتحاد کی ترغیب اور واضح وژن کے درمیان دیواروں میں گھری ہوئی ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔

استدلال پر جتنا شدید حملہ ہمارے دور میں کیا گیا ہے اتنا کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ زرتشت کے عظیم طوفان سے لے کر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اِن سے بالاتر کوئی خُدائی منشاء ہو۔ کرکیگارڈ کے موذی مرض سے لے کر اُس روگ تک جو موت کی طرف لے جاتا ہے، جس کی کسی نے پیروی نہیں کی، جہاں لغو فکر کے اہم اور اذیتی موضوعات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ کم از کم عقائد اور مذہبی موضوعات اس قسم کی ہلچل سے دور رہے ہیں۔ جیسپر سے ہیڈگر تک، کرکیگارڈ سے چیسٹو تک، مظہر پسندوں سے شیلر تک اخلاقی اور منطقی اُڑن کھٹولے پر سوار دانشوروں کا پورا گروہ خودکشی کے روگ میں مبتلا رہا۔ یہ اپنے ہی مقاصد یا طریقوں کی مخالفت کرتے رہے لیکن استدلال کے شاہی راستے کو روکنے اور سچائی کے سیدھے راستے کو دریافت کرنے میں ثابت قدم رہے۔ یہاں پر میں اُن خیالات کے واضح ہونے اور زندہ رہنے کو فرض کرتا ہوں جو ناقابلِ بیان کائنات کی شرح کرتے ہیں جن کا آغاز تضادات، تناقصات اور اضطراب سے ہوتا ہے۔ ان میں ایسے موضوعات مشترک ہیں جو ان پر منکشف ہوئے۔ یا ان کے لئے بھی کہنا چاہیے کہ سب سے اہم وہ نتائج تھے جو

انھوں نے ان دریافتوں کی بناء پر اخذ کیے۔ یہ بات اتنی اہم ہے کہ اس کا الگ الگ معائنہ کرنا چاہیے۔ یہاں تک ہم ان کی دریافتوں اور تجربات کو سمجھنے کے لئے فکر مند ہیں۔ ہم ان کے اتفاقات کو سمجھنے کے بارے میں پریشان ہیں۔ ان کے فلسفے کے ساتھ برتاؤ کرنا گستاخی ہوگی تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے موسم کو منظر پر لایا جائے جو سب کے لئے مشترک ہے۔

ہیڈگر سرد مہری کے ساتھ انسانی حالت پر غور کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ زندگی کی تذلیل کی گئی ہے۔ زندگی کی پوری کڑی میں واحد حقیقت 'اضطراب' ہے۔ انسان دُنیا اور اس کے بہلاؤں میں گم ہو چکا ہے۔ اس کا اضطراب خوف کی وجہ سے ہے تاہم جب انسان خوف سے آگاہ ہوتا ہے تو اضطراب بن جاتا ہے۔ ایک انسان موت کے ذریعے زندگی پر غور کرتا ہے۔ فلسفے کا یہ پروفیسر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر دُنیا کی سب سے مجرّد زبان میں لکھتا ہے کہ 'انسانی زندگی کا اٹل اور محدود کردار بذاتِ خود انسان کی نسبت زیادہ بنیادی ہے۔' اس کی کانٹ میں دلچسپی اس کے 'خالص استدلال' کو تسلیم کرنے تک وسعت رکھتی ہے۔ تجزیے کے آخر میں وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ 'اضطراب سے بھرے انسان کو دُنیا کچھ نہیں دے سکتی۔' یہ اضطراب اُسے دُنیا میں تمام کیٹگریز سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ وہ صرف اسی کے بارے میں سوچتا اور بات کرتا ہے۔ وہ اس کے پہلوؤں کو شمار کرتا ہے کہ بوریت عام انسان کی زندگی کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ جب انسان موت پر غور کرتا ہے تو دہشت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے شعور کو فضولیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ موت کا شعور اضطراب کا بلاوا ہے جس کے بعد زندگی اپنے آپ کو شعور کے ذریعے اپنا ہی حکم سُناتی ہے۔ یہ اضطراب کی آواز ہے جو زندگی کو طعنہ دیتی ہے کہ وہ 'گمنامی (جمع کا صیغہ) کے بعد واپس لوٹ رہی ہے۔' اس لئے انسان کو منزلِ مقصود تک سونا نہیں چاہیے۔ وہ بے سروپا دُنیا میں کھڑا ہو کر اس کے بے ثباتی کردار کو نمایاں کرتے ہوئے ان تباہیوں کے اندر اپنا راستہ تلاش کرتا ہے۔

جیسپر وجودیاتی فلسفے سے مایوس ہے کیونکہ اس میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم معصومیت کھو چکے ہیں۔ وہ جانتا ہے ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ جانتا ہے ذہن کا

اختتام ناکامی پر ہوتا ہے۔ وہ اُن روحانی مُہمات کا منتظر ہے جو تاریخ میں ظاہر ہوئیں اور بے رحمی سے ہر نظام کے اندر خامیوں کو بے نقاب کرتی رہیں یعنی وہ سراب جس نے ہر شے کو بچایا اور وہ تبلیغ جس نے ہر کسی کو بے نقاب کیا۔ اس بدحال دُنیا میں علم کی ناممکنیت قائم کی جاتی ہے جس میں دائمی لاشئیت واحد حل معلوم ہوتی ہے اور ناقابلِ علاج مایوسی واحد رویہ نظر آتا ہے وہ 'آریانے کا دھاگہ' دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خدائی رازوں تک رسائی کرنے میں مدد دے۔

چیسٹو اپنی طرف سے حیرت انگیز طور پر اُکتا دینے والے کام میں انہی سچائیوں کی تلاش کرتا رہا اور ان تھک انداز میں اس کسے ہوئے نظام کی تشریح کرتا رہا جو عالمی استدلال اور عقائد پر منڈلاتا رہا۔ طنزیہ حقائق یا بے سروپا تضادات میں سے کوئی بھی استدلال کی قدر و قیمت گھٹاتے ہوئے اسے بدظن نہ کر سکا۔ اُسے صرف ایک چیز میں دلچسپی نظر آتی تھی اور وہ اعتراض تھا جو ذہن میں تھا یا دل کے دائرہ اختیار میں تھا۔ وہ دوستوفسکی کے ملامتی انسان کے تجربات، نشائی ذہن کی اشتعالی مہمات، ہیلمٹ کی بددعاؤں یا السین کی کوڑی کڑوی اشرافیہ کے ذریعے لاعلاجی کے خلاف انسانی بغاوت کی شرح کرتا رہا۔ اس کو قابلِ فہم بناتا رہا اور اس کو روشن کرتا رہا۔ وہ انسانی استدلال اور اس کے موسموں سے انکار کرتے ہوئے اُس بے رنگ صحرا کے درمیان کچھ فیصلوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا جہاں تمام سچائیاں پتھر بن چکی تھیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ کرکیگارڈ ہے جو کم از کم اپنے عہد کی لغویت ضرور دریافت کرتا ہے۔ یہ شخص لکھتا ہے، ''خودسر خاموشی کی سچائی زبان قابو میں رکھنا نہیں بلکہ اظہار میں ہے۔'' شروع سے ہی یقین کرنا کہ کوئی اٹل سچائی نہیں ہے اور اس کے عوض زندگی کو تسکین دینا ناممکن ہے۔ ڈان جون نے ''اخلاقیاتی اصلاحی مقالات'' اسی وقت لکھے تھے جس وقت قنوطی روحانیت کا مینوئل ''مغوی کی ڈائری'' لکھا تھا جس میں وہ قلمی ناموں اور تضادات کو ضرب دیتا ہے۔ وہ تسلیوں، اخلاقیات اور قابلِ بھروسہ اصولوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

جس کانٹے کی دل میں چبھن محسوس کرتا ہے اس کی تکلیف کو خاموش کرانے کی بجائے بیدار کرتا ہے اور تختہ دار پر چڑھنے والے انسان کی مایوس خوشی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ریزہ ریزہ سچائی کو جوڑتا ہے۔ معقولیت اور انکار کو عقیدہ بناتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیٹگری ہے جو انسان کی ملکیت ہے۔ جس چہرے پر شفقت اور نفرت ہے رقصی چکر کے بعد اسی کے دل سے چیخ نکلتی ہے جو بذاتِ خود ایسی بے سروپا روح ہوتی ہے جو اپنے ہی فہم سے ماورا حقیقت سے نبرد آزما رہتی ہے۔ جس روحانی سکینڈل نے کرکیگارڈ کو اپنی محبوب کے سکینڈل تک پہنچایا ایک تجربے کی ابتری سے شروع ہوا اور اپنے ہی تناظر میں ڈوب گیا اور اس کی ابتدائی غیر آہنگیوں کو جلاوطن کر گیا۔

ہسرل اور مظاہریت پسندوں نے اپنی شاہ خرچیوں سے دُنیا کو اس کی متنوع حالت میں دوبارہ بحال کیا اور استدلال کی ماورائی قوت سے انکار کیا۔ ان کے ذریعے روحانی کائنات معصومیت سے مالا مال ہوگئی۔ گلابی پھول کی پتیاں، سنگِ میل اور انسانی ہاتھ اتنے اہم ہیں جتنی محبت، خواہش اور قانونِ کششِ ثقل ہیں۔ سوچ اہم اصولوں کے روپ میں مختلف باتوں کو یک جا اور ہم آہنگ کرنا بند کر دیتی ہے۔ سوچ ایک بار پھر مجموعی طور پر شعور پر فوکس کرنے، توجہ مرکوز کرنے اور سمجھنے کے لئے سبق بن جاتی ہے جو ہر خیال اور ہر تصور کو پروست کے انداز میں استحقاقی لہجے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ فکر کا جواز انتہا پسندانہ شعور پیش کرتا ہے۔ کرکیگارڈ یا جیسٹو کی نسبت ہسرل کا انداز زیادہ مثبت ہے جو غور و فکر کے کلاسیکی طریقوں کی نفی کرتا ہے، اُمید کو مایوس کرتا ہے، الہام کو کھولتا ہے اور دل کے مجموعی طور پر مظہر کو پیدا کرتا ہے، جس کی متاع غیر انسانی ہے۔ یہ راستے یا تو تمام علوم کی طرف جاتے ہیں یا کسی کی طرف نہیں جاتے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس حالت میں ذرائع مقاصد سے زیادہ اہم ہیں۔ جو کچھ بھی شامل کیا جاتا ہے وہ 'فہم کے رجحانات' کو شامل کرتا ہے نہ کہ دلاسوں کو۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ کم از کم غور و فکر کے آغاز میں ایسا رویہ بہت کم ہوتا ہے۔

اِن دانشوروں کو سمجھنے میں ایک انسان کیسے ناکام ہوسکتا ہے ! ایک شخص یہ سمجھنے میں کیسے ناکام ہوسکتا ہے کہ وہ اُس تلخ اور استحقاقی لمحے کے گرد ثابت قدم ہے جس میں اُمید کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ایک انسان ہر شے کی وضاحت چاہتا ہے یا کچھ بھی نہیں چاہتا۔ استدلال جب دل کی چیخ سُنتا ہے تو بانجھ ہو جاتا ہے۔ استدلال سے تحریک پانے والا ذہن تضادات اور حماقتوں کے علاوہ کچھ نہیں پا سکتا۔ انسان جو نہیں سمجھ سکا وہ حماقتیں تھیں کیونکہ دُنیا حماقتوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسان بذاتِ خود دُنیا کا جو معنی نہ سمجھ سکا وہ عقیدہ ہے۔ اگر ایک بھی شخص صرف اتنا کہہ سکتا کہ "سب واضح ہے" تو سب کچھ بچ سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کا یہ دعویٰ کہ یہ کچھ بھی نہیں جانتے اور ایسا کہنے کے لئے ایک دوسرے سے برتری لے جانے کی کوشش کرتے رہے جس سے بدنظمی پھیلی جب کہ تمام انسانوں کو اپنے اردگرد دیواروں کی معقولیت اور مطلقیت کا علم بھی تھا۔

تمام تجربات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ ذہن جب اپنی حدود پر پہنچتا ہے تو اس کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور نتائج میں سے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ کام ہوتا ہے جہاں خودکشی اور اس کے جواب مقیم ہوتے ہیں۔ لیکن میں اس تحقیق کی ترتیب اُلٹنا چاہتا ہوں اور ذہن کی اس مہم سے آغاز کرتے ہوئے روز مرّہ کے کاموں کی طرف آتا ہوں۔ تمام تجربات صحرا میں پیدا ہوتے ہیں جن کو ہمیں پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے۔ کم از کم یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کوشش کے اس نقطے پر انسان غور و فکر کے آمنے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر استدلال اور خوشی کی چاہت محسوس کرتا ہے۔ لغویت عقائد اور انسانی ضروریات کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو بھولنا نہیں چاہیے بلکہ اس سے چمٹ جانا چاہیے کیونکہ زندگی کے تمام نتائج کا دارومدار اسی پر ہے۔ لغویت، عقائد اور تاریخ پرستی کے تصادم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہی اس ڈرامے کی تین خصوصیات ہیں ان کو لازماً اس منطق کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیے جس کی زندگی اہل ہوتی ہے۔

فلسفیانہ خودکشی

دنیا کی فضولیت اور زندگی کے بیکار ہونے کا احساس خودکشی کا سبب ہوسکتا ہے۔ یہ احساس اُس اصول تک محدود نہیں رہتا جس کی بنیاد پر انسان کائنات میں اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ اس کے پاس آگے جانے کا موقع ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ زندگی گزار چکا ہے۔ اسے مرنا چاہیے یا بیدار ہونا چاہیے۔ یہی وہ عنوان ہے جس کو ہم حل کرنا چاہتے ہیں۔ میری دلچسپی ان الفاظ میں نہیں جن کی تنقید دوسری جگہ اور شکل کا بلاوا ہوتی ہے بلکہ یہ دریافت ہے کہ ان کے نتائج کیا ہیں۔ شاید ذہن کبھی لاتعلق نہیں رہتا۔ پھر بھی ہم روحانی مناظر کو بعینہ پہچان لیتے ہیں جس میں سے ہم گذرتے ہیں۔ اس طرح متفرق علمی زونوں کے باوجود وہ چیخ جو سیاحتی گھنٹیوں پر ختم ہوتی ہے آخر نکل جاتی ہے۔ ظاہر ہے جن مفکرین کا ہم نے ذکر کیا ہے اُن کی سوچ ایک جیسی ہے۔ یہ کہنا کہ موسم مہلک ہے، گھٹن سے بھرپور آسمان کے نیچے ایک شخص مجبور ہے۔ اس کے سامنے دو راستے ہیں یا تو یہاں سے بھاگ جائے یا اس کی گھٹن برداشت کرے۔ پہلی حالت میں لوگ بھاگ کیسے جائیں اور دوسری حالت میں مقیم کیوں رہیں؟ اسی انداز سے ہی میں نے خودکشی کے مسئلے کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب تک ہم نے زندگی کے بیکار ہونے کے گرد چاروں اطراف سے خط کھینچا ہے۔ اب تک ہم حیران ہیں کہ یہ تصور کتنا واضح ہے، براہ راست تجربات سے ایک طرف اس کے معنی اور دوسری طرف اس کے نتائج دریافت کرنے کی جدوجہد کتنی آسان ہے۔

اگر میں ایک معصوم شخص پر جرائم پیشہ ہونے کا الزام لگاؤں یا اگر میں ایک متقی شخص سے کہوں کہ اُس نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا ہے تو وہ جواب دے گا کہ یہ بے سروپا الزام ہے۔ اس کی برہمی کا مضحکہ خیز پہلو سامنے آتا ہے۔ لیکن اس میں منطق موجود ہے۔ اس جواب سے متقی انسان اخلاقی قانون کے منکر ہونے سے انکار کرتا ہے جو اس کی پوری زندگی

کے اعمال اور میرے الزام کے درمیان تضاد سے واضح ہوتا ہے۔ ''یہ بے سروپا ہے'' کا مطلب ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اگر میں تلوار سے مسلح شخص کو مشین گنوں سے لیس گروپ پر حملہ کرتے ہوئے دیکھوں تو میں اس کے عمل کو لغو کہوں گا۔ یہ لغویت اس کے ارادے اور حقیقت کے عدم توازن کی وجہ سے ہے جس کا وہ سامنا کرتا ہے۔ میں یہ تضاد اس کی سچی قوت اور ارادے کے درمیان دیکھتا ہوں۔ جب ہم اس فیصلے کا موازنہ ظاہراً نتائج سے کرتے ہیں تو لغویت سامنے آتی ہے۔ اسی طرح نتائج کے موازنوں سے ایسی دلیل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جس کو ایک شخص قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں سادہ حالات سے لے کر پیچیدہ حالات تک لغویت کی عظمت میرے موازنے کی دونوں اصطلاحوں کے درمیان فاصلے کی براہ راست شرح کرتی ہے۔ لغو شادیاں، لغو چیلنج، لغو تعصب، لغو خاموشیاں، لغو جنگیں حتیٰ کہ امن کے معاہدے بھی لغو ہوتے ہیں۔ تمام لغویت موازنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ لغویت کا احساس صرف حقیقت کی سکروٹنی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ٹھوس حقیقت اور ارادے کے درمیان موازنے سے پیدا ہوتا ہے یعنی عمل اور دُنیا کے درمیان موازنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر لغویت جدائی ہے۔ یہ نہ تو موازنے کے عناصر میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی تصادم میں پائی جاتی ہے۔

سوچ کے اس کرّے پر میں کہہ سکتا ہوں کہ لغویت نہ تو انسان کے اندر ہوتی ہے اور نہ ہی دُنیا میں پیدا ہوتی ہے بلکہ دونوں کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے یہ دونوں کو جوڑتی ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو صرف واقعات تک محدود کرتا ہوں تو میں جانتا ہوں کہ ایک شخص کیا چاہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ دُنیا اُسے کیا پیش کرتی ہے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اسے کیا چیز جوڑتی ہے۔ مجھے مزید گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں۔ تلاش کے لئے یقین کافی ہے۔ تمام نتائج اسی سے اخذ کرنا پڑیں گے۔

نتیجہ اخذ کرنا منطق کا بنیادی اصول ہے۔ اس طریقے سے روشنی میں لائی گئی عجیب تثلیث یقیناً چکا چوند کرنے والی دریافت نہیں ہے بلکہ تجربات کے مواد سے بنائی گئی ہے اسی

لئے یہ سادہ اور پیچیدہ ہے۔ اس کا پہلا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کسی بھی ایک اصطلاح کو تباہ کرنے کا مطلب کُل کو تباہ کرنا ہے۔ انسانی ذہن کے باہر لغویت نہیں پائی جا سکتی۔ ہر شے کی طرح لغویت کا اختتام بھی موت پر ہوتا ہے۔ اس دُنیا کے باہر لغویت نہیں ہے۔ اسی بنیادی معیار کے ذریعے میں لغویت کے عام اصول کا فیصلہ کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ میری پہلی سچائی ہے۔ منطق کا وہ اصول جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے نمودار ہوتا ہے۔ اگر میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ یہ سچ ہے تو مجھے اس کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر میں ایک مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے کم از کم اس کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرے نزدیک نقطہ آغاز لغویت ہے۔ میری پہلی انکوائری کی شرط اسی بنیادی شے کو محفوظ کرتی ہے جو مجھے کچلتی ہے۔ میں اسی کا بطور تصادم اور جاری جدوجہد کا تعین کرتا ہوں۔

اس لغو منطق کو انجام تک پہنچانے کے لئے میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جدوجہد اُمید کی غیر موجودگی (جس کا مایوسی سے کوئی تعلق نہیں ہے) میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ مسلسل انکار (جس کو دستبرداری سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے) اور شعوری بے چینی (جس کو ناقص بے آرامی کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے) ہے جو تباہ کرتی ہے۔ جادو کرتی ہے یا ان لوازمات کی مشق کرتی ہے (رضامندی کے ساتھ شروع ہوتے ہوئے یہ جدائی کا تختہ اُلٹتی ہے)۔ لغویت کو برباد کرتی ہے اور اس رویے کی قدر گھٹاتی ہے جس کو تجویز کیا جا سکتا ہے۔ جب تک لغویت اتفاق نہیں کرتی تب تک اس کے معنی ہوتے ہیں۔

بظاہر حقیقت موجود ہے جو مکمل طور پر اخلاقی معلوم ہوتی ہے یعنی ایک انسان اپنی ہی سچائیوں کا شکار رہتا ہے۔ ایک دفعہ اُس سے سرزد ہو جائیں تو وہ ان سے کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص کو کچھ نہ کچھ ادا کرنا چاہیے۔ جو شخص لغویت سے باخبر ہو جاتا ہے ہمیشہ اس کے بندھن میں بندھ جاتا ہے۔ اُمید سے خالی مگر زندگی سے باخبر انسان مستقبل کی ملکیت نہیں رہتا۔ یہ فطری بات ہے۔ اسی لئے فطری ہے کیونکہ وہ اس کائنات سے فرار کی

کوشش کرتا ہے جس کا وہ تخلیق کار ہے۔ جن باتوں کا پہلے ذکر آ چکا ہے وہ بہت اہم ہیں۔ با اعتقاد لوگوں نے استدلالیت پسندی پر تنقید سے آغاز کرتے ہوئے لغویت کی آب وہوا کو تسلیم کیا تھا۔ اس راستے کی جانچ پڑتال کے علاوہ کوئی راستہ بھی ایسا نہیں جس پر انہوں نے نتائج کو تکمیل تک پہنچایا ہو۔

اپنے آپ کو موجودیاتی فلسفے تک محدود کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ان میں چند لوگوں کے علاوہ سب نے فرار کا راستہ تجویز کیا تھا۔ لغو استدلال کے ذریعے لغویت سے آغاز کرتے ہوئے استدلال کی بربادی تک، ایک بند کائنات میں جو انسان تک محدود ہے، انسان نے اُسی فلسفے کی پوجا کی جس نے اسے کچل دیا۔ اسی میں اُمید کی دلیل تلاش کی جس نے اسے کنگال کیا۔ آخر کار سب کو اُمید مذہب میں ہی نظر آئی۔ اس لیے مذہب ہی حقیقی توجہ کا حقدار ٹھہرا۔

میں یہاں پر چند رویوں کا تجزیہ کروں گا جو چیسٹو اور کرکیگارڈ کو عزیز تھے۔ جیسپر نے تحریری شکل میں اس قسم کے "ٹھیٹھ" رویے کی مثال پیش کی ہے۔ وہ بُلندی کو محسوس کرنے اور تجربے کی گہرائی کو سمجھنے میں نااہل اور بے بس نظر آتا ہے اور اس کائنات کے بارے میں باخبر ہے جس کو ناکامی تہس نہس کر دیتی ہے۔ کیا وہ اس ناکامی سے سبق سیکھتا ہے یا آگے بڑھ جاتا ہے؟ وہ کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کرتا۔ وہ تجربے سے اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ کوئی بھی تسلی بخش اصول قائم نہیں کر پاتا۔ کسی جواز کے بغیر وہ اپنے آپ سے کہتا ہے اور ایسا کہتے ہوئے تجربات کے جوہر اور زندگی کی عظمت کا دعویٰ کرتا ہے۔ جب وہ لکھتا ہے، "کیا ناکامی کسی ممکنہ وضاحت اور شرح سے آگے، عدم کی بجائے خدا کی موجودگی کو منکشف کرتی ہے؟" وہ زندگی جو انسانی اعتماد کے اندھے عمل کے ذریعے اچانک ہر شے کی وضاحت کرتی ہے عمومیت اور قابلِ ذکر ناقابل سوچ یک جہتی کو واضح کرتی ہے۔ اور لغویت فہم کی روشنی بن جاتی ہے جو ہر چیز کو واضح کر دیتی ہے۔ منطقی طور پر استدلال کو کوئی شے تیار نہیں کرتی۔ میں اسے جست کہہ سکتا ہوں۔ جتنی تلخی سے جیسپر دلیل کے قبل از خیال کو

تباہ کرتا ہے اتنی تیزی سے دُنیا کی وضاحت کرتا ہے۔ ذلت بھرے خیال کا یہ حواری تذلیل کے آخر میں اخلاقی اصلاح پانے والی زندگی کے ذرائع کو گہرائی تک پاتا ہے۔

صوفیانہ فکر نے ہمیں بہت سی ایسی تراکیب سے روشناس کرایا جو ذہن کے کسی بھی رویے کی وضاحت کرتی ہیں۔ میں اداکاری کے دوران بھی ایسے عمل کرتا ہوں جیسے کسی مخصوص مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ رویے کی عمومی قدر کو پہلے سے جج کیے بغیر میں صرف یہ غور کر سکتا ہوں کیا یہ اُن حالات کا سامنا کر سکتی ہے جس کا میں نے اپنے لئے انتخاب کیا ہے؟ کیا یہ اُس تصادم کے اہل ہے جو میری تشویش کا سبب ہے۔ اس طرح میں چیسٹو سے دوبارہ رُجوع کرتا ہوں جس کا ایک تجزیہ نگار نے حوالہ دیا تھا جو دلچسپی کا حامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''واحد حل خاص طور پر وہاں ہوتا ہے جہاں انسانی قیاس حل تلاش نہیں کر سکتا۔ ورنہ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ خدا میں موجود ہے؟'' ہم خدا کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں تاکہ ناممکن کو حاصل کر سکیں۔ جہاں تک ممکن کا تعلق ہے تو اس کے لئے 'انسان کافی ہے۔' میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر صرف 'چیسٹوین فلاسفی' ہوتی تو اس کا خلاصہ کیا جا سکتا تھا۔ جب اُس کے پر جوش تجزیے کے آخر میں چیسٹو مکمل زندگی کی بُنیادی بے سروپائی دریافت کرتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ 'یہ بے سروپائی ہے' بلکہ یہ کہتا ہے کہ 'یہ خُدا ہے' ہمیں اس پر بھروسہ کرنا چاہیے حتیٰ کہ اگر وہ ہماری استدلالی کیٹگریز کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا پھر بھی اسی پر انحصار کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کنفیوژن ممکن نہ ہو کیونکہ روسی فلاسفر اشارہ کرتے ہیں کہ شاید فطرت بھی عداوت اور نفرت، تضاد اور غلط فہمی سے بھری ہوتی ہے۔ تاہم اس کا چہرہ جتنا چھپایا جاتا ہے وہ اُتنی ہی طاقت سے نمودار ہوتی ہے۔ اس کی عظمت انتشار میں ہے۔ اس کا ثبوت غیر انسانیت میں ہے۔ ایک شخص کو اس میں جمپ لگا کر ''استدلالی سراب'' سے باہر نکلنا چاہیے۔ چیسٹو کے لئے بے سروپائی کو قبول کرنے کا مطلب بے سروپائی کا حامی ہونا ہے۔ بے سروپائی کے بارے میں معلومات ہونا اسے قبول کرنے کے مترادف ہے۔ اس فکر کی پوری منطقی کوشش اُمید کو بحال کرنے میں ہے تاکہ فوری اُمید بحال

ہو جائے۔ مجھے دوبارہ کہنے دیں کہ یہ رویہ جائز ہے۔ میں یہاں پر اس مسئلے اور اس کے نتائج پر غور کرتا ہوں۔ انسان کو عقیدے کے عمل یا فکر کے جنوں کا معائنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس پوری زندگی پڑی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ استدلال پسندوں کو چیسٹو کا رویہ پسند نہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ چیسٹو کا رویہ استدلال پسندوں کی نسبت زیادہ صحیح ہے۔ اب میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کیا وہ بے سروپائی کے احکامات سے وفادار ہے یا نہیں؟

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بے سروپائی اُمید کے برعکس ہے تو یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ چیسٹو کے لئے موجودیاتی فکر پہلے سے ہی بے سروپائی فرض کر لیتی ہے اور اس کو دور کرنے کے لئے ثابت قدم رہتی ہے۔ اس قسم کی فکری نزاکت جادوگر کی جذباتی چال معلوم ہوتی ہے۔ جب چیسٹو دلیل اور اخلاقیات کے برعکس اپنی دلیل دیتا ہے تو وہ اسے سچائی اور نجات کہتا ہے۔ اس دلیل میں چیسٹو خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس اصول کی پوری قوت اسی میں مُضمر ہے تو یہ ہماری اُمید کے مقابل سامنے آتی ہے۔ اگر یہ محسوس کر لیا جائے کہ زندگی کے بے کار احساس کو برقرار رکھنے کے لئے منظوری درکار نہیں ہوتی تب اس کو واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے سچے پہلو کو کھو چکی ہے یعنی اپنے انسانی اور اضافی کردار کو کھو چکی ہے تاکہ خُدائی میں داخل ہو سکے جو نا قابلِ فہم ہے۔ زندگی کے لغو اور فضول ہونے کا احساس صرف انسانی وصف ہے۔ جس لمحے یہ اصول اپنے آپ کو خُدا سے جوڑتا ہے اُسی لمحے انسانی فہم سے تعلق توڑ لیتا ہے۔ زندگی کے فضول ہونے کا احساس ایسی گواہی نہیں دیتا جس کی منظوری کے بغیر انسان اس کو دریافت نہیں کر سکتا۔ اس دریافت کے لئے جدوجہد سے گریز کیا جاتا ہے۔ انسان زندگی کے بے کار ہونے کے احساس کی تکمیل کرتا ہے اور اس شرط پر اس کے بنیادی کردار کے غائب ہونے کا باعث بنتا ہے جو جدائی، مخالفت اور مجروح ہونے کا سبب ہوتے ہیں۔ اسے فرار کی جست کہہ سکتے ہیں۔ چیسٹو ہیملٹ کے ریمارکس کا حوالہ دیتا ہے، ''وقت قید سے آزاد ہے''۔ شیکسپیئر نے لکھا یا ہیملٹ نے کہا کا یہ

مفہوم نہ تھا۔ عقیدے کا نشہ روشن ذہن کو زندگی کے بے کار ہونے کے احساس سے دور کر دیتا ہے۔ چیسٹو کے نزدیک دلیل بے کار ہے تاہم استدلال سے ماورا بھی کوئی شے ہے؟ ایک بے سروپا ذہن کے لئے استدلال بے کار ہے اور استدلال سے آگے کچھ نہیں ہے۔

کم از کم یہ دلیل ہمیں لغویت کی سچی فطرت کی نسبت زیادہ روشن خیال نظر آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ توازن کے علاوہ سب بے کار ہے۔ چیسٹو توازن ہی کو تباہ کر دیتا ہے اور ان اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح پر زور دیتا ہے۔ ہماری فہم کی بھوک اور خُدا کی طرف لوٹ جانے کا جنون اُسی حد تک قابلِ توضیح ہیں جس حد تک ہم ان کو سمجھ سکتے ہیں اور اِن کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ مکمل طور پر استدلال سے انکار بے سود ہے۔ اس کا اپنا نظام ہے جس میں یہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ خاص طور پر یہ انسانی تجربہ ہے۔ ہم ہر شے کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہم ایسا نہیں کر سکتے تو بے سروپائی پیدا ہوتی ہے، بے سروپائی ہمیشہ شورش زدہ عقیدے کے ساتھ محدود استدلال کے ملاقاتی نقطے پر پیدا ہوتی ہے۔ جب چیسٹو ہیگل کے قول کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یعنی، شمسی نظام کی حرکت ناقابلِ تغیر قوانین سے مشابہت رکھتی ہے اور یہ قوانین اس کا استدلال بنتے ہیں۔ جب وہ سپنوزا کی عقلیت پسندی کو اُلٹنے کے لئے اپنا پورا جنوں وقف کر دیتا ہے تو حقیقت میں وہ ہر قسم کے استدلال کے نخروں کی حمایت میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ وہ ناجائز اور فطری کایاپلٹ کے ذریعے عقیدے کی پہلے سے ہی برتری قائم کرتا ہے۔ تاہم تغیر واضح نہیں۔ ہوسکتا ہے یہاں پر حد کا اصول اور لیول کا اصول مداخلت کریں۔ ممکن ہے فطرت کے قوانین مخصوص اصولوں کے مطابق عمل کرتے ہوں جن سے آگے یہ اپنے آپ کو اپنے ہی خلاف لغویت کو جنم دیتے ہوں۔ ہوسکتا ہے وضاحت کی حد تک اپنا جواز پیش کریں کیونکہ استدلال صرف وضاحت کی حد تک سچا ہوتا ہے۔ عقیدے کے سامنے ہر شے قربان کر دی جاتی ہے اور وضاحت کے مطالبے کو سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بے سروپائی موازنے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف بے سروپا انسان اس قسم کے معیاری پراسیس کو اختیار ہی نہیں کرتا۔ وہ جدوجہد کو تسلیم

کرتا ہے اور استدلال کو کوسنے کی بجائے عقیدے کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ دوبارہ تجربے کے مواد کے ساتھ ایک ہی نظر میں بغل گیر ہو جاتا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ بیدار شعور کے ساتھ اُمید کی مزید جگہ نہیں ہے۔

جو بات لیو چیسٹو میں قابلِ فہم ہے وہ کرکیگارڈ میں زیادہ واضح ہے۔ یقیناً ایک مصنف کے لئے اِن واضح مفروضات کا خاکہ کھینچنا مشکل ہے۔ جو اس کی متضاد تحریروں کے باوجود اس کی پُرفریب تحریروں میں جھلکتی ہیں جیسے سچائی کا پیش اندیشہ ہوں جو باقی ماندہ تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہیں لہٰذا کرکیگارڈ بازی لے جاتا ہے۔ اس کا بچپن عیسائیت کی مذہبی تعلیمات سے اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ خود بخود ہی اس کے سب سے درشت پہلو کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے نزدیک مذہب کا معیار قانونی تضاد اور تناقص میں ہے۔ جس بنیادی چیز نے زندگی کے معنی اور گہرائی کو مایوسی کی طرف دھکیلا اُسی نے مایوسیت کو معنی اور زندگی کو گہرائی بخشی اور اس کو سچائی اور بلاغت فراہم کی۔ جس چیز کی کرکیگارڈ دعوت دیتا ہے وہ اگنیتیس لویلا [Ignatius Loyola] کی تیسری قربانی ہے جس میں خدا خوش ہوتا ہے یعنی عقل کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ 'جست' کا یہ اثر نرالا ہے لیکن ہمیں اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بے سروپائی کو اگلی دُنیا کا اصول بتاتا ہے جب کہ یہ اسی دُنیا کے تجربے میں بسیرا کرتی ہے۔ کرکیگارڈ کہتا ہے کہ "دنیا کو تیاگ دینے والا انسان اپنی ناکامی میں ہی اپنی فتح تلاش کرتا ہے۔"

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ یہ رویہ کس قسم کی دھواں دھار تبلیغ سے جُڑا ہوا ہے۔ مجھے صرف یہ بات حیران کرتی ہے کہ لغویت کا نظارہ اور کردار اس کی وضاحت کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس نقطے پر ایسا نہیں ہے۔ لغویت کے متن پر غور کرنے کے بعد ایک شخص اس طریقہ کار پر بہتر طور پر غور کر سکتا ہے جو کرکیگارڈ میں روح پھونکتا ہے۔ وہ دُنیا میں عقیدے اور بے سروپائی کے سرکش عارضے کے درمیان توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ اُن تعلقات کا احترام نہیں کرتا جو خاص طور پر لغویتی احساسات کی تشکیل کرتے ہیں۔ عقیدے سے بچ نکلنے کے

قابل نہ ہونے کے یقین کے بعد وہ اپنے آپ کو اس مایوسی سے بچانا چاہتا ہے جو اسے بے نتیجہ نظر آتی ہے۔ اگر وہ اس نقطے پر اپنی ججمنٹ میں سچا ہے تو اپنی نفی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنی بغاوتی چیخ کا ہیجانی کیفیت سے تبادلہ نہیں کر سکتا تو اس کی رہنمائی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کی اس بے سروپائی کے ساتھ رہنمائی کرے جو اُسے روشن خیال بناتی ہیں اور یقین سے محروم کرتی ہیں۔ ایبے گلیانی [Abbe Galiani] کہتا ہے بیماری کا علاج نہیں کرنا چاہیے، اس بیماری کے ساتھ زندہ رہنا چاہیے۔ اس کے برعکس کرکیگارڈ علاج چاہتا ہے۔ علاج اُس کی جنونی خواہش ہے جس کا ذکر اُس کے پورے رسالے میں موجود ہے۔ اس کی پوری سوچ انسان کو اس قانونی تضاد سے بچاتی ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے بات کرتا ہے تو اپنی خودنمائی کا ادراک کرتا ہے گویا خدا کا خوف اور رحم بھی اُس کے ذہن کو پُرسکون نہیں کر سکا۔ مبالغہ آمیز سُخن سازی سے وہ عقیدے کو وضع قطع فراہم کرتا ہے اور بے سروپائی کو خُدا سے منسوب کرتا ہے جو نا قابلِ فہم ہے۔ صرف ذہانت ہی انسانی دل میں چھپے ہوئے مطالبات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یعنی کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا اس لئے سب کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔

درحقیقت خود کرکیگارڈ ہمیں یہ راستہ دکھاتا ہے۔ میں یہاں پر کوئی تجویز نہیں دینا چاہتا لیکن ایک شخص اس کی تحریروں اور روح کو ارادتاً مسخ کرنے کے نشانات دیکھ سکتا ہے تا کہ بے سروپائی کے ساتھ مسخ شدگی کا توازن برقرار رکھا جا سکے؟ یہی رسالے کا بُنیادی خیال ہے۔ میں جس چیز سے محروم ہوں وہی مردانگی کی علامت جو مرد کا مقدر ہوتا ہے...... لیکن تب مجھے جسم دیں...... اُف! جوانی کے ایام میں بھی زندگی کے لئے جسمانی لوازمات نہیں دیئے گئے تھے حتیٰ کہ چھ ماہ کے لئے...... مجھ میں جو کمی تھی بنیادی طور پر وہ جسم تھا۔ زندگی کے لئے جسمانی شرائط پوری کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کہیں بھی کرکیگارڈ اُمید کی چیخ نہیں سُنتا جو صدیوں بعد بھی بے شمار دلوں کو زندہ کرنے کے باوجود اس بے سروپا انسان کو با اُمید نہ بنا سکی۔ مسیح کے پیروکار کے لئے موت ہی ہر شے کا اختتام نہیں ہے جو ہم پر زندگی کی

نسبت اُمید کو زیادہ لاگو کرتی ہے حتیٰ کہ جب زندگی میں صحت اور قوت چھلکتی ہو۔ شاید یہ ایک شخص کو اُمید کے برعکس موت کا نتیجہ اخذ کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اگر باہمی سمجھ بوجھ کے احساسات خودکشی کی طرف لے جاتے تو پھر یہ نہ کہا جاتا کہ زیادتی کسی چیز کی توثیق کرتی ہے۔ جیسا کہا جاسکتا ہے یہ انسانی سکیل سے ماورا ہے اس لئے اسے سپر ہیومن ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس میں منطقی سچائی نہیں۔ اس میں تجرباتی مفروضہ نہیں۔ جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ میری پہنچ سے آگے ہے۔ اگر میں اس سے انکار نہیں کرتا تو کم از کم اس میں قابلِ فہم شے بھی نہیں پاتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کیا میں اس کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہوں جو میں جانتا ہوں؟ مجھے دوبارہ بتایا جاتا ہے کہ ذہانت کو اپنا تکبر قربان کرنا چاہیے اور استدلال کو سجدہ ریز ہونا چاہیے۔ لیکن اگر میں استدلال کی حدود تسلیم کر لوں تو میں اس کی اضافی قوتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی تردید نہیں کرسکتا۔ میں صرف اس کے درمیانی راستے پر رہنا چاہتا ہوں جہاں ذہانت وضاحت کرسکتی ہے۔ اگر یہی اس کا جاہ و جلال ہے تو مجھے اس کو ترک کرنے کا جواز دکھائی نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر کرکیگارڈ کے نقطۂ نظر کے علاوہ کوئی شے ایسی نہیں جس کے مطابق مایوسی حقیقت نہ ہو بلکہ گناہ کی بنیادی حالت ہے۔ گناہ ہی خُدا سے بیگانہ کرتا ہے۔ لغویت باشعور انسان کی مابعدالطبیعاتی حالت ہے جو خدا کی طرف رہنمائی نہیں کرتی۔

اسی لغویت کے ساتھ زندہ رہنے کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ذہن اور دُنیا ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے بغیر ایک دوسرے کے خلاف کھینچا تانی کر رہے ہیں۔ میں اس حالت میں حکمرانی کے بارے میں استفسار کرتا ہوں اور جس بات کی پیش کش کی جاتی ہے اس کی بنیادوں سے انکار کرتا ہوں اور متضاد اصطلاحوں میں سے کسی ایک کی نفی کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جہالت اور اندھیرے میں کیا فرق ہے اور مجھے یقین ہے کہ جہالت ہر شے کی وضاحت کرتی ہے۔ جہالت ہی میری روشنی ہے۔ میرے ارادے کا جواب نہیں دیا جاتا اور یہ معرکۃ الآرا تغزل مجھ سے اس پیراڈاکس [paradox] کو چھپا نہیں سکتا۔ اس لئے

ایک شخص کواس سے لاتعلق ہوجانا چاہیے۔ ممکن ہے کر کیگارڈ وارننگ کے انداز میں چیخے کہ اگر انسان کو شعور نہیں، اگر تہہ میں صرف جنگلی قوت ہر شے پیدا کر رہی ہے جس میں بڑے اور چھوٹے اندھیرے شامل ہیں، اگر بے پیندے کے برتن کو کائنات کی تمام اشیاء بھی نہیں بھر سکتیں تو وہاں زندگی مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتی؟ یہ چیخ بے سروپا انسان کو مایوسی اور خودکشی سے روک نہیں سکتی۔ یہ تلاش کرنا کہ سچ کیا ہے تلاش نہیں ہے اس لئے یہ قابلِ حصول بھی نہیں۔ گویا زندگی کیا ہے بے کار سوال ہوگا؟ ایک شخص کو گدھے کی طرح سراب کے پھول عادتاً کھاتے رہنے چاہئیں۔ تب لغو ذہن جھوٹ سے دست بردار ہوتے ہوئے بے خوف کر کیگارڈ کے جواب یعنی 'مایوسی' کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ہر غور وفکر والی شے کو مستقل مزاج روح سنبھال لیتی ہے۔

میں اس نقطے پر موجودیاتی رویہ کو فلسفیانہ خودکشی کہہ رہا ہوں۔ اس پر قیاس لاگو نہیں ہوتا۔ اس تحریک کو ظاہر کرنے کے لئے فکر نہ صرف اپنی ہی تردید کرتی ہے بلکہ اپنے آپ کو اس کی تردید سے ماورا کرنے کے لئے مائل کرتی ہے۔ موجودیت پسندوں کے لئے انکار فطرت ہے۔ اس فطرت کو صرف انسانی استدلال کے انکار کے ذریعے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ خودکشی کی طرح فطرت انسانوں کے ساتھ ہی تبدیل ہوجاتی ہے۔ استدلال کی جست لگانے کے کئی طریقے ہیں جن میں پہلا طریقہ زندگی کی جست لگانا ہے۔ زندگی سے نجات دلانے والا انکار وہ حقیقی تضاد ہے جو زندگی کی نفی کرتا ہے جس کی طرف ابھی تک چھلانگ نہیں لگائی گئی۔ یہ انکار مذہبی فیضان سے پھوٹتا ہے جس طرح دوسرا انکار استدلالی نظام سے پھوٹتا ہے۔ یہ ہمیشہ دائمیت کا دعویٰ کرتا ہے اور اسی دعویٰ میں ہی جمپ لگا سکتا ہے۔

اس مضمون میں اس دلیل کو آگے بڑھایا گیا ہے جو ہمارے روشن خیال عہد کے سب سے عام روحانی رویہ کو بھلا چکا ہے جس کی بنیاد دلائل پر ہے جس کا مقصد دُنیا کی وضاحت کرنا ہے۔ اس خیال کو قبول کرنے کے بعد فطری بات ہے کہ اس کو واضح کرنے کے لئے

زیادہ بلیغ نقطہ نظر اپنانا چاہیے۔ یہ بات ضرور جائز ہے لیکن اس کا استدلال سے کوئی تعلق نہیں جس کی ہم پیروی کر رہے ہیں۔ درحقیقت ہمارا مقصد ذہن کی شروعات پر روشنی ڈالنا ہے جو دُنیا کے معنی کے بغیر فلسفے سے شروع ہوتے ہوئے اس میں گہرائی اور معنی تلاش کرنے پر ختم ہوتی ہیں۔ جو ہر لحاظ سے سب سے زیادہ رقت انگیز مذہب ہے جو عقیدے کو فروغ دیتا ہے۔

میں یہاں پر ہسرل اور دوسرے مظاہر پسندوں کے استعمال کردہ 'ارادے' کے موضوع کا جائزہ لوں گا۔ میں نے پہلے ہی اس کا حوالہ دیا ہے۔ ابتداء میں ہسرل کا طریقہء استدلال کلاسیک طریق کار کو رد کرتا تھا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ایک عظیم اصول کے روپ میں سوچ کا مقصد ظاہریت کو بنانے اور یکساں کرنے سے مانوس کرنا نہیں ہے۔ سوچنا لرننگ ہے جو ایک شخص کے شعور کی رہنمائی کرتے ہوئے ہر خیال کو اپنا مالک خود بنانے میں مدد دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مظہریت پسندی دُنیا کی وضاحت سے انکار کرتی ہے۔ جو حقیقی تجربات کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ بے سروپے فکر کے ابتدائی اصرار میں تائید کرتی ہے کہ سچ کچھ نہیں بلکہ صرف سچ ہے۔ شام کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے لے کر میرے کاندھے پر رکھے ہوئے اس ہاتھ تک ہر شے سچ ہے۔ شعور ہی شعور کی وضاحت کر سکتا ہے۔ شعور اپنے فہم کا مفعول نہیں بنتا یہ صرف اس پر فوکس کرتا ہے۔ یہ توجہ کا عمل ہوتا ہے۔ برگسانی شبیہ کو مستعار لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پراجیکٹر سے مشابہت رکھتا ہے جو اچانک تصویر پر فوکس کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ منظر نامہ موجود نہیں تاہم مسلسل اور بے ربط تشریح موجود ہے۔ اس جادو کے فانوس میں تمام تصویریں استحقاقی ہیں۔ شعور جس شے پر توجہ کرتا ہے اس کو تجربے کے ذریعے عارضی طور پر روک دیتا ہے۔ معجزے کے ذریعے یہ ان کو الگ تھلگ کر دیتا ہے۔ یہ تمام فیصلوں سے ماورا ہے۔ یہ 'ارادہ' ہے جو شعور کی خصلت بیان کرتا ہے۔ لیکن لفظ خُدا کے خیال پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ اس کو رہنمائی کے معنوں میں لیتا ہے جس کی واحد قیمت معروفہ (وہ قیمت جو سکے پر لکھی ہوتی ہے) جغرافیائی مطالعہ ہے۔

پہلی ہی نظر میں ایسے نظر آتا ہے جیسے کوئی شے بھی معقول نہیں۔ فکر اپنی ہی وضاحت تک محدود رہتی ہے کیونکہ یہ وضاحت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جس کا نتیجہ خلافِ قیاس تجربات سے مالا مال ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں فکر کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک نفسیاتی اور دوسرا مابعد الطبیعاتی۔ اسی لئے دو سچائیوں کی حمایت کی جاتی ہے۔ اگر ارادتاً دعوؤں کا مقصد صرف نفسیاتی رویّوں کی وضاحت کرنا ہوتا تو کوئی شے بھی اسے بے سروپا روح سے جُدا نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا مقصد اس کو شمار کرنا ہوتا جس سے یہ آگے جا ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف تائید کرتی کہ کسی یک رنگ اصول کے بغیر فکر کے تمام نمایاں پہلو کو بیان کرنے اور سمجھنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے ان میں ہر پہلو کے بارے میں شامل سچ نفسیاتی ہے۔ اس میں اس 'حق' کی تائید کی جاتی ہے جو حقیقت پیش کرتی ہے۔ سوئی ہوئی دُنیا کو جگانے اور ذہن کے لئے واضح کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ لیکن اگر ایک شخص سچائی کے اصول کو استدلالی بنیاد پر جاننے کی کوشش کرتا ہے، اگر ایک شخص علم کے ہر مفعول کے جوہر کو دریافت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ تجربے کے ذریعے اس کی گہرائیوں کو دریافت کرسکتا ہے۔ ایک لغویتی ذہن ناقابلِ فہم ہے۔ یہ عزت اور یقین کے درمیان جھولا جھولتا ہے جو ارادتاً رویّے کے لئے قابلِ توجہ ہوتا ہے اور مظہریاتی فکر کی ٹمٹماہٹ کسی بھی دوسری شے سے بہتر بے سروپے استدلال کی وضاحت کرتی ہے۔

ہسرل 'اضافی۔ زمانی جوہر' کی بات کرتا ہے جو ارادے کے ذریعے منظر پر آتا ہے اور وہ فلاسفر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ تمام چیزوں کی وضاحت ایک چیز کی بجائے تمام چیزوں سے ہوتی ہے۔ مجھے کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ یقیناً وہ خیالات جن کو شعور ہر وضاحت کے آخر میں متاثر کرتا ہے ماڈل تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔ لیکن دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ براہِ راست ادراک کے ہر نقطہءِ آغاز میں موجود ہوتے ہیں۔ مزید یہ خیال نہیں جو ہر شے کی وضاحت کرتا ہے بلکہ خیالات کی لامحدود تعداد ہے جو بے شمار اشیاء کی وضاحت کرتی ہے۔ دُنیا ایک مقام پر آکر روشن ہو جاتی ہے۔ افلاطونی عقیدہ، وجود وجدانی بن جاتا ہے لیکن پھر

بھی عقیدہ ،وجود ہی رہتا ہے۔ کرکیگارڈ کو اُس کا خدا ہضم کر جاتا ہے، پرمینید اس خُدا کی فکر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ لیکن فکر اپنے آپ کو خیالی بُت پرستی میں دھکیل دیتی ہے۔ یہی کافی نہیں ہے، وہم اور افسانہ اضافی۔ زمانی جوہر کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ خیالات کی نئی دُنیا میں دو نسلی حشرات (دیو مالا میں ایک جانور جس کا جسم گھوڑے کا اور اوپر کا دھڑ آدمی کا ہوتا ہے) میٹرو پولیٹن انسان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

لغو انسان کی نفسیاتی رائے میں تلخی کے ساتھ ساتھ سچائی بھی تھی کہ دُنیا کے تمام پہلو استحقاقی اور رعایتی ہیں۔ یہ کہنا کہ ہر شے استحقاقی ہے یہ کہنے کے مساوی ہے کہ ہر شے کی قیمت ایک جیسی ہے۔ سچائی کے اس خیالی پہلو کے نتائج دور رس ہیں کہ ابتدائی ردِ عمل کے ذریعے وہ شاید اپنے آپ کو افلاطون کے زیادہ قریب سمجھتا ہے۔ درحقیقت اسے پڑھایا جاتا ہے کہ ہر تصور مساوی اور استحقاقی جوہر رکھتا ہے۔ ترتیبی نظام (Hierarchy) کے بغیر اس مثالی دُنیا میں رسمی فوج صرف جرنیلوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یقیناً برتری کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن فکر میں اچانک تبدیلی دُنیا میں ایک قسم کا عظیم انقلاب لاتی ہے جو کائنات کو گہرائی میں بحال کراتی ہے۔

میں اس موضوع کو اتنی دور تک لانے میں خوفزدہ تھا جس کو تخلیق کاروں نے بڑی چوکسی کے ساتھ انجام دیا؟ میں نے ہسرل کے صرف دعووں کو پڑھا جو ظاہراً مذہبی لیکن منطقی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر اس مقدمے کو آگے بڑھایا جاتا اور اس کو قبول کر لیا جاتا یعنی جو کچھ سچ ہے خدائی طور پر سچ ہے۔ سچائی ایک ہے جو بعینہٖ ویسی ہی ہے تاہم مخلوق کے ذریعے مختلف نظر آتی ہے جو اس کا ادراک کرتی ہے یعنی انسان، دیو پیکر جانور، فرشتے اور خدا۔ اس مقالے میں استدلال غالب نظر آتا ہے اور اس آواز کے ساتھ بگل بجائی جاتی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لغو دُنیا میں اس دعویٰ کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ خُدا یا فرشتے کا ادراک میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ جیومیٹری کا نقطہ جہاں خدائی استدلال میری تصدیق کرتا ہے میرے لئے ہمیشہ نا قابلِ فہم رہتا ہے۔ میں یہاں پر بھی اسی جست کی

شناخت کرتا ہوں جس کو مجرد طور پر انجام دیا جاتا ہے میرے لئے اس کا مطلب اس کو بھول جانا ہے جو میں بھولنا نہیں چاہتا۔ ہسرل مزید وضاحت کرتا ہے، ''اگر دلکشی کے تمام موضوعات اور دعائیں غائب ہو جائیں تو پھر بھی دلکشی کے قانون کو تباہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ دلکشی ہر قسم کے اطلاق کے بغیر رہ سکتی ہے'' میں جانتا ہوں کہ میرا سامنا خیالی تسلیوں سے کیا جاتا ہے۔ اگر مجھے اس نقطے کو دریافت کرنا ہوتا جہاں فکر شہادت کے راستے رُخصت ہوتی تو مجھے اس کے مساوی استدلال کو دوبارہ پڑھنا پڑتا جو ہسرل نے ذہن کے متعلق لکھا ہے ''اگر ہم نفسیاتی پراسیس کے بالکل درست قوانین پر توجہ مرکوز کر سکتے تو ان کو اسی طرح دائمی اور غیر تغیر پذیر دیکھا جا سکتا تھا جس طرح کسی بھی فطری سائنس کے بنیادی قوانین کو دیکھا جاتا تھا۔ یہ تب بھی معقول ہوتا جب کوئی نفسیاتی پراسیس نہ ہوتا۔'' اگر ذہن نہ بھی ہوتا اس کے قوانین ہوتے! تب میں یہ سمجھتا کہ وہ نفسیاتی سچائی جس کو ہسرل استدلالی قاعدہ بنانا چاہتا تھا، انسانی استدلال کے اجزا سے مرکب بنانے والی قوتوں سے انکار پر مشتمل ہوتی جو اس چارہ کار کے ذریعے ابدی استدلال تک چھلانگ لگاتی۔

ہسرل کی 'ٹھوس کائنات' کے موضوعات مجھے حیران نہیں کرتے۔ اگر مجھے بتایا جاتا کہ تمام جوہر رسمی نہیں بلکہ مادی ہیں۔ اگر پہلا منطق کا اور دوسرا سائنس کا موضوع ہوتا تو صرف ان کی تشریح کا سوال باقی بچتا۔ مجھے بتایا گیا کہ تصور اپنے آپ کے تسلسل کے صرف جز کا اشارہ کرتا ہے۔ لیکن پہلے سے ہی نوٹ کیے گئے عقیدے میں تزلزل اصطلاحوں کی وضاحت کی اجازت دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے میری توجہ کا ٹھوس مدعا یہ آسمان، اس کوٹ پر پانی کا واحد عکس حقیقت کے اثر کو محفوظ کرتا ہے جس کو میری دلچسپی اس دُنیا سے الگ کر دیتی ہے اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوٹ بذات خود بھی عالمی ہے جس کا مخصوص جوہر شکلوں کی دُنیا کی ملکیت ہے۔ میں یہ جان لیتا ہوں کہ جلوس کی صرف ترتیب تبدیل کر دی گئی ہے۔ اس دُنیا کا کائنات پر عکس پڑنا رک جاتا ہے لیکن آسمانی شکلیں زمینی شکلوں میں وضع ہوتی رہتی ہیں۔ تاہم میرے لئے کچھ تبدیل نہیں

ہوتا۔ میں یہاں پر ٹھوس کا ذائقہ چکھنے کی بجائے انسانی حالت کے معنی میں دانشوریت پاتا ہوں جو بذاتِ خود ٹھوس کو عمومی بناتی ہے۔

ظاہراً ایسے عقائد پر حیران ہونا بے کار ہے جو فکر کو محکوم استدلال اور حاکم استدلال کے متضاد راستوں کے ذریعے اپنی ہی نفی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہسرل کے خیالی خُدا سے لے کر کرکیگارڈ کے آنکھوں کو چکا چوند کرنے والے خُدا کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ منطق اور غیر منطق ایک جیسی تبلیغ کرتی ہیں۔ سچ ہے کہ راستے اہم ہیں لیکن بہت کم منزل تک پہنچاتے ہیں۔ پہنچنے کی منشاء کافی سمجھی جاتی ہے۔ خیالی فلاسفر اور مذہبی فلاسفر ایک ہی انتشار سے شروع کرتے ہیں اور ایک ہی جیسے اضطراب سے ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اصل کی وضاحت ہونی چاہیے۔ علم حاصل کرنے کی بجائے جنت میں جانے کا روگ غالب نظر آتا ہے۔ ہمارا عہد دُنیا کے غیر اہم فلسفوں سے رنگین ہے جو نتائج کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ حقیقت کی رجعتی عقلیت پسندی فکر کو معیاری استدلال میں توڑنے کا ارادہ رکھتی ہے جب کہ غیر عقلیت پسندی اس کو مسترد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ان کا آپس میں فاصلہ صاف نظر آتا ہے۔ ان کی آپس میں ایڈجسٹ منٹ کی بات ہے۔ دونوں حالتوں میں جست کافی ہے۔ دلیل آرائی کا اصول یک طرفہ ہے۔ سچ کہنے کے لئے خواہش کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو یہ خواہش بھی دوسری خواہشات کی طرح غیر مستحکم ہوتی ہے۔ منطق پر انسانی پہلو کنداں ہے اس لئے یہ خدا کی طرف لوٹ جانے کی اہل نہیں۔

پلوٹونس نے پہلی دفعہ دائمی موسم کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا۔ اُس نے سکھایا تھا کہ کیسے عزیز اصولوں سے منہ موڑا جاتا ہے۔ یہ ایک تضاد ہے جو اس کو مضبوط کرنے کے لئے شراکت کے جادوئی پہلو کا تقاضہ کرتا ہے یہ جو بذاتِ خود فکر کی بجائے فکر کا آلہ ہے۔ سب سے برتر انسان کی فکر اُس کے واپس لوٹ جانے کی تشویش ہے۔

جس طرح منطق پلوٹونس کی افسردگی کو تسکین دے سکتی تھی اور خُدا کے مانوس نظام میں ذات کو تسکین دینے کا ذریعہ تھی، اس طرح دُنیا نہ استدلالی ہے اور نہ غیر استدلالی بلکہ نامعقول ہے۔ ہسرل کے نزدیک غوروفکر کی حد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس لغویت اپنی حدود قائم کرتی ہے کیونکہ یہ اضطراب کو خاموش کرانے میں بے بس ہے۔ کرکیگارڈ دعویٰ کرتا ہے کہ اضطراب سے انکار کے لئے ایک ہی حد کافی ہے۔ لغو انسان اس سے آگے نہیں جاسکتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ حد استدلال کی خواہش پر ہدایت پاتی ہے۔ عقیدے کا موضوع اپنے ہی انکار سے کنفیوژ ہوتا ہے اور اپنے ہی آپ سے بھاگتا ہے جیسا موجودیت پسندوں نے اس کا ادراک کیا تھا۔ لغویت روشن غوروفکر ہے جو اپنی حدود کا جائزہ لیتی ہے۔

اس مشکل راستے کے آخر میں لغو انسان اپنے سچے محرکات کو تسلیم کرتا ہے۔ جب اس کی اندرونی حالت کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اچانک ایسے محسوس کرتا ہے جیسے اپنا رُخ بدل رہا ہو۔ ہسرل کی کائنات میں دُنیا واضح ہو جاتی ہے اور ایسی بے تکلفی کی خواہش کرتی ہے جو انسان کے دل میں پناہ حاصل کرتے ہوئے بے کار ہو جاتی ہے۔ کرکیگارڈ کے مکاشفے میں ہر شے کی خواہش ترک ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر یہ اپنی تسکین چاہتی ہے۔ گناہ کو اتنا نہیں جانا جاتا جتنا جاننے کی خواہش کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ واحد گناہ ہے جس کے بارے میں لغو انسان محسوس کر سکتا ہے کہ یہ اس کی معصومیت اور گناہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسے ایک حل پیش کیا جاتا ہے۔ جس مین ماضی کے تمام تضادات مناظرے کی صورت میں ایک کھیل پیش کرتے ہین۔ ان کی سچائی کو محفوظ کیا جاتا ہے جو بے چینی پر مشتمل ہوتی ہے۔

میرے غوروفکر کا مقصد اس گواہی کے ساتھ وفاداری ہے۔ یہ گواہی خلاف عقل ہے۔ یہ متجسس ذہن اور مایوس دُنیا کے درمیان جدائی ہے۔ واپس لوٹ جانے کا جنوں، منتشر کائنات اور تضادات ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کرکیگارڈ میرے واپس جانے کے جنوں کو کچل دیتا ہے جب کہ ہسرل اس کو دُنیا سے جوڑ دیتا ہے۔ اس کو جاننے کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو اسے قبول کرنا چاہیے یا رد کرنا

چاہیے۔ بے سروپائی کھلتے ہوئے انکار کے ذریعے گواہی چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جاننا اہم ہے کہ ایک شخص اس کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں؟ یا کیا دوسری طرف منطق ایک شخص کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ اس کے لئے جان دے؟ میری دلچسپی فلسفیانہ خودکشی کی بجائے صرف خودکشی میں ہے۔ میں اس کو جذباتی مضمون سے پاک کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس کی منطق اور یک جہتی کو جان سکوں۔ بے سروپا ذہن کے لئے کوئی بھی دوسری پوزیشن اپنے آپ کو روشنی میں لانے سے پہلے ہی پسپائی ہے۔ ہسرل فرار کی خواہش کا دعویٰ کرتا ہے، 'شعور کی سوچنے اور زندہ رہنے کی کہنہ مشق عادت ہے' لیکن چھلانگ اس میں دوام اور راحت بحال کرتی ہے۔ یہ چھلانگ انتہا پسندانہ خطرات کی نمائندگی نہیں کرتی جیسا کرکیگارڈ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس خطرہ نازک لمحے میں ہے جو چھلانگ پر مقدم ہے۔ اسی چکا چوند استدلال پر براجمان رہنا یک جہتی ہے..... باقی سب سخن سازی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بے چارگی نے کبھی اتنا اہم اتحاد کو زندہ نہیں کیا ہوتا جتنا کرکیگارڈ نے زندہ کیا تھا۔ لیکن اگر بے چارگی کی تاریخ کی لاتعلقی میں اپنی جگہ ہے تو اس کی غور و فکر میں کوئی جگہ نہیں جس کی ضرورت کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔

بے سروپا آزادی

کچھ حقائق ایسے ہیں جن کو میں الگ الگ نہیں کر سکتا۔ میں کیا جانتا ہوں، کس پر یقین رکھتا ہوں، کس کی تردید کرتا ہوں، میں کسی سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں انہی باتوں کو شمار کر سکتا ہوں۔ میں اپنی طرف سے ہر شے سے انکار نہیں کر سکتا جو مبہم جنتِ گم گشتہ میں جانے کا روگ ہے۔ لیکن جنت میں جانے کی خواہش، اس معمے کو حل کرنے کی آرزو، اس کی وضاحت اور اس سے پیوستگی سے انکار کیا جاتا ہے۔ میں ہر شے سے انکار کر سکتا ہوں۔ میں اس انتشار کے علاوہ جو خدائی مساوات میں موجود ہے ہر شے سے انکار کر سکتا ہوں جس میں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں اس انتشار سے خفا ہو سکتا ہوں یا باغ باغ ہو سکتا ہوں جو انار کی سے

چھوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ دُنیا با معنی ہے یا نہیں جس کو سمجھنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اسکا معنی نہیں جانتا اور میرے لئے اس کے معنی جاننا ممکن بھی نہیں۔ میرے حالات میرے لئے کیا معنی رکھتے ہیں؟ میں ان کو صرف انسانی اصطلاحات میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ جسے میں چھو سکتا ہوں، جن کے خلاف مزاحمت کر سکتا ہوں۔ یہی کچھ ہے جسے میں سمجھ سکتا ہوں۔ یقین۔ میری خود مختاری اور اتحاد اس دُنیا کو عقل اور قابلِ استدلال اصول بنانے کی حد تک گھٹا دینے کی رغبت رکھتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ جھوٹ کے بغیر میں دوسری سچائی کو تسلیم کر سکتا ہوں۔ اُمید کے بغیر، جس سے میں محروم ہوں، میرے حالات کی حدود کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔

اگر میں درختوں کے درمیان درخت ہوتا، جانوروں کے درمیان بلّی ہوتا تو اس زندگی کے یقیناً معنی ہوتے یا یہ مسئلہ نہ اُٹھایا جاتا کیونکہ میں اس دُنیا کی ملکیت ہوتا۔ میں اس دُنیا کی ہستی ہوتا جس کی میں شعوراً مخالف پوزیشن میں ہوں۔ میرا اصرار اس سے مانوسیت پر ہے۔ یہ نامعقول غور و فکر جو مجھے تخلیق کے خلاف لا کھڑا کرتا ہے۔ میں قلم کی ایک ضرب کے ساتھ اس کو ختم نہیں کر سکتا جس کے سچ ہونے پر میرا یقین ہے۔ مجھے اس کو ضرور محفوظ کرنا چاہیے۔ مجھے بظاہر وہ نظر آتا ہے جو میرے خلاف ہوتا ہے۔ جو اس تصادم کی بنیاد، دُنیا اور ذہن کے درمیان وقفے کی تشکیل کرتا ہے وہ اس کی بیداری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے؟ اگر مجھے اس کو محفوظ رکھنا ہے تو مجھے ہمیشہ کے لئے زندہ اور بیداری کے ذریعے یاد رکھنا چاہیے۔ اس لمحے بے سروپائی کو جیتنا جتنا آسان نظر آتا ہے اُتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ انسان زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے اور اس کے دل میں گھر بسا تا ہے۔ اس لمحے ذہن روشن کوشش کا خشک، سوکھا ہوا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ راستہ اب روز مرّہ زندگی سے اُبھرتا ہے۔ گمنام دُنیا کا سامنا کرتا ہے یعنی صیغہ غائب 'واحد' ہے، تاہم انسان اس میں اپنی بغاوت اور روشنی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ نپٹنا بھول جاتا ہے۔ آخر زمانہ حال کا دوزخ ہی اس کی سلطنت بنتا ہے۔ تمام مسائل اپنی دھاریں تیز کرتے ہیں۔ شکلوں اور رنگوں کی شاعری

کے سامنے خیالی شہادت پسپائی اختیار کرتی ہے۔ روحانی تصادم مادی شکل اختیار کر لیتا ہے اور انسان کے دل کی حقیر اور شاندار پناہ گاہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ان میں سے کسی شے کو بھی حل نہیں کیا جاتا۔ تمام چیزوں کی پہلے سے زیادہ حسین شکل دکھائی دیتی ہے۔ خیالات کی عمارت دوبارہ تعمیر کرتے ہوئے اور اپنے ہی سکیل کو وسعت دیتے ہوئے کیا ایک شخص خودکشی کر سکتا ہے؟ کیا اس کے برعکس ایک شخص بے سروپائی کی دلخراش اور عجیب وغریب شرط کو اختیار کر سکتا ہے؟ اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماحصل اخذ کرتے ہیں۔ جسم، عشق، تخلیق، ایکشن، انسانی شرافت اور پاگل دُنیا میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ آخر انسان لغویت کی شراب اور لاتعلقی کی روٹی کھاتے ہوئے اپنی عظمت کو غذا پہنچاتا ہے۔

اس راستے کے مخصوص مقام پر بے سروپا انسان کو لالچ دیا جاتا ہے۔ تاریخ پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کی محتاج نہیں حتیٰ کہ خدا کی بھی محتاج نہیں۔ اسے جست کہا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اچھے طریقے سے نہیں سمجھتا کیونکہ یہ واضح نہیں ہے۔ در اصل وہ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا سوائے اس کے جس کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ خود پسندی گناہ ہے، لیکن وہ گناہ کے اصول کو نہیں سمجھتا۔ جس کے مقدر میں شاید دوزخ ہے۔ اس کا تخیل بھی کافی نہیں جو اس عجیب مستقبل کا نقشہ کھینچ سکے جس کے مطابق وہ غیر فانی زندگی ضائع کر رہا ہے جس پر سوچ بچار لاحاصل ہے۔ اُس سے گناہ تسلیم کروانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو معصوم سمجھتا ہے۔ سچ کہتے ہوئے یہی محسوس کرتا ہے۔ اُس کی ناقابلِ تلافی معصومیت ہے۔ یہ معصومیت اُسے ہر شے کی اجازت دیتی ہے۔ اپنے آپ سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اسی پر زندہ رہے، تاکہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکے۔ جو شے بھی غیر یقینی ہے اسے اپنے ذہن میں جگہ نہ دے۔ پہلے اُسے بتایا جاتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کم از کم جو کچھ ہے وہ یقینی ہے۔ اس کا تعلق اسی سے ہوتا ہے یعنی وہ اس میں پناہ ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

اب میں خودکشی کے نظریے کا دوسرا رُخ دیکھتا ہوں۔ پہلے ہی اس پر تفصیل سے بات ہو چکی ہے کہ اس کا حل کیا ہے؟ پہلے یہ سوال تھا کیا زندہ رہنا با معنی ہے یا بے معنی ہے؟ اس کے جواب میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اگر زندگی بے معنی ہوتی تو بہتر طور پر زندہ رہا جا سکتا تھا۔ تجربے کے طور پر زندہ رہنا مقدر میں لکھا ہوا سمجھ کر رہنے سے بہتر ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی تقدیر کو بے سروپائی سمجھ کر زندہ نہیں رہتا۔ جب تک وہ شعور کی روشنی میں بے سروپائی کے شیشے سے ہر شے پر غور نہیں کرتا تب تک ان اصطلاحات میں سے کسی ایک سے انکار کرتے ہوئے زندہ رہنا اس سے بچنے کے مترادف ہے۔ شعوری بغاوت کچلنا مسئلے سے آنکھ چُرانا ہے۔ مستقل انقلاب کا موضوع انفرادی تجربے میں لایا جاتا ہے۔ زندہ رہنا بے سروپائی کو زندہ رکھنا ہے۔ اس کو زندہ رکھنا اس پر غور و فکر ہے۔ لغویت تبھی مرتی ہے جب ہم اس سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ یوں فلسفیانہ پوزیشن بغاوت ہے۔ جو انسان اور اس کی اپنی ہی گُمنامی کے درمیان مسلسل تصادم ہے۔ یہ ناممکن شفافیت پر اسرار ہے۔ یہ ہر سیکنڈ دُنیا کو چیلنج کرتی ہے۔ جس طرح خطرہ انسان کو بے مثل موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ شعور کو اپنی گرفت میں لے اسی طرح خیالی بغاوت بیداری کو تجربے تک وسعت دیتی ہے۔ جو انسان کی آنکھوں میں مستقل موجود رہتی ہے۔ یہ تمنا نہیں ہے یہ اُمید سے خالی ہے۔ یہ بغاوت کچلنے والے مقدر کا یقین ہے۔ دست برداری کے بغیر اُس کو ہم رکاب ہونا چاہیے۔

یہی بات سمجھنی چاہیے کہ لغویت کا تجربہ خودکشی سے کتنا دور ہے۔ ہو سکتا ہے اس مفروضے پر غور کیا جائے کیا خودکشی بغاوت کی پیروی کرتی ہے۔ لیکن غلط طریقے سے؟ کیونکہ یہ بغاوت کے منطقی ماحاصل کی نمائندگی نہیں کرتی۔ یہ تابعداری کے برعکس ہے۔ جست کی طرح خودکشی کو اس کی انتہا پسندی کی حد تک قبول کیا جاتا ہے۔ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے اور انسان اپنی تاریخ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ وہ اس حد تک خودکشی سے بچتا ہے کہ یہ ایک ساتھ ہی بیداری اور موت کی تردید ہو جاتی ہے۔ ملامتی انسان کی فکر چند قدم دور اپنے چکا چوند زوال کے دہانے پر ہر شے کو دیکھتی ہے۔ درحقیقت خودکشی کے برعکس وہ انسان

ہوتا ہے جسے سزائے موت دی جاتی ہو۔

بغاوت زندگی کو اس کی قدر دیتی ہے۔ پوری زندگی تک پھیلا ہوا یہ سلسلہ زندگی کی شان و شوکت بحال کراتا ہے۔ جو شخص اندھیاری (جو گھوڑے کی آنکھوں پر ڈال دیتے ہیں) سے محروم ہے اسے ذہانت سے بہتر کوئی بینائی نہیں ملتی جس نے اس حقیقت کو پکڑ لیا ہے جو اس سے ماورا ہوتی ہے۔ انسانی عقل و دانائی کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ وہ ڈسپلن جو ذہن اپنے آپ پر لاگو کرتا ہے، وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے کہ اس کی جدوجہد میں کوئی خاص شے ہے۔ اس حقیقت کو کمزور کرنے کے لئے جس کی غیر انسانیت انسان کے جاہ و جلال کی تشکیل کرتی ہے اس کو اپنی ذات میں ہی کمزور کرنے کے مساوی ہے۔ تب ہی میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ وہ اصول جو ہر شے کی وضاحت کرتا ہے اپنے ساتھ انسان کو ناتواں کیوں کر دیتا ہے؟ مجھے میری ہی زندگی کے بوجھ سے نجات دلاتا ہے لیکن پھر بھی میں تنہا ہی اس کو لے کر چلتا ہوں۔ اس اتصال پر میں یہ ادراک نہیں کر سکتا کہ غیر معتقد خیال کو ترکِ دُنیا کی اخلاقیات کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

شعور اور بغاوت دست برداری کے برعکس دھتکار ہیں۔ انسانی دل میں ہر شے غیر متزلزل اور تند مزاجی زندگی کے برعکس اس میں جان ڈال دیتی ہے۔ سرِ تسلیم خم کرنے کے بغیر مرنا پڑتا ہے جو آزاد انسان کی منشاء ہوتی ہے۔ خودکشی تردید ہے۔ لغو انسان ہی صرف ہر شے کو اس کے تلخ اختتام تک لے جاتا ہے اور اپنے آپ کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ بے سروپائی کو انتہا پسندانہ تناؤ کے ذریعے برقرار رکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس شعور میں بے سروپائی واحد سچائی کا ثبوت ہے جو اس کی علانیہ نافرمانی ہے۔

اگر میں قبل از وقت ترتیب دی گئی پوزیشن میں رہتا ہوں جو تمام نتائج اخذ کرنے پر مشتمل ہوتی ہے اور نئے دریافت کیے گئے تصور میں مصروف ہو جاتا ہوں تو میں ایک اور المیے کا سامنا کرتا ہوں۔ اس طریقہ کار سے وفادار رہتے ہوئے میرا خیالی آزادی سے

کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ جاننا کہ انسان آزاد ہے یا نہیں میرے لئے دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں صرف اپنی آزادی کا تجربہ کرتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے کسی عمومی تصور کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تھوڑی سی بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس طرح آزادی کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ چونکہ یہ مختلف انداز سے خدا کے مسئلے کے ساتھ جُڑتی ہے۔ یہ جاننا کہ انسان آزاد ہے یا نہیں اس آگہی کو شامل کرتا ہے کیا اس کا کوئی آقا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے کی خاص طور پر بے سروپائی اس حقیقت سے آتی ہے کہ بُنیادی عقیدہ آزادی کے مسئلہ کو ممکن بناتا ہے بلکہ اس کے تمام معنی بھی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ خُدا کی موجودگی میں بدی کی بجائے آزادی کا مسئلہ شاید ہی اُٹھایا جاتا ہو۔ آپ جانتے ہو کہ یا تو ہم آزاد نہیں اور سب سے طاقتور فطرت ہی شر کی ذمہ دار ہے۔ یا ہم آزاد اور ذمہ دار ہیں، طاقتور فطرت کا وجود نہیں۔ تمام علمی نزاکتوں نے نہ تو کسی شے کا اضافہ کیا ہے اور نہ ہی اس پیراڈاکس کی شدت سے کسی شے کو کم کیا ہے۔

اسی لئے میں اس حمد وثناء میں گم نہیں ہوسکتا یا اس تصور کی وضاحت اس کے معنی کھو دیتی ہے اور میرے انفرادی تجربے کے معیاری اصولوں سے آگے نکل جاتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خُدا نے مجھے کس قسم کی آزادی دی ہے۔ میں مراتب کا مفہوم کھودیتا ہوں۔ میرا آزادی کا واحد تصور ریاست کے وسط میں ایک آزاد فرد یا قیدی کا تصور ہے۔ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ عمل اور فکر کی آزادی ہے۔ اگر لغو انسان ایک طرف دائمی آزادی کے امکانات کو رد کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے اعمال کی آزادی کو روشن کرتا ہے۔ تو اس مستقبل اور اُمید کی جدوجہد کا مطلب انسان کی موجودگی میں اضافہ کرنا ہے۔

لغویت کا سامنا کرنے سے پہلے عام انسان با مقصد زندگی گزارتا ہے جو مستقبل یا زندگی کے جواز کی فکر کرتا ہے (کون اور کیا ہے اس کی پریشانی نہیں ہوتی)۔ وہ اپنے امکانات کو تولتا ہے، وہ 'تھوڑی سی زندگی' کو شمار کرتا ہے، جس میں اُس کی ریٹائرمنٹ یا بچوں کی پرورش شامل ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی زندگی کی رہنمائی کی جاسکتی ہے۔ سچ

ہے وہ ایسے عمل کرتا ہے جیسے وہ آزاد ہے خواہ تمام حقائق اُس آزادی کے متضاد مقام کو بناتے ہوں۔ لیکن لغویت کے بعد ہر شے اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ وہ خیال، میں ہوں میرا عمل کرنے کا طریقہ گویا ہر شے بامعنی ہے (خواہ میں نے کسی مقام پر کہا ہو کہ کوئی شے بھی بامعنی نہیں ہے)۔ ممکنہ موت کی بے سروپائی کے فیشن سے سر چکرانا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی سوچ ایک شخص کے لئے مقصد قائم کرتی ہے، ترجیحات بناتی ہے۔ ان سب باتوں میں آزادی کے عقیدے کو پہلے سے فرض کر لیا جاتا ہے، خواہ ایک شخص کبھی کبھار تحقیق کرتا ہو مگر اس کو محسوس نہ کرتا ہو۔ اس مقام پر میں اچھی طرح آگاہ ہوں کہ وہ خدائی آزادی۔۔۔ اُس آزادی کا ہونا ہے جو تن تنہا سچائی کی بُنیاد بن سکتی ہے وہ موجود نہیں ہے۔ موت ہی واحد حقیقت ہے۔ موت کے بعد ہر شے مقام پر آجاتی ہے۔ میں اپنے آپ کو بھی دوام بخشنے کے لئے آزاد نہیں ہوں بلکہ غلام ہوں ایک ایسا غلام جو خدائی انقلاب کی اُمید کے بغیر ہے۔ حقارت کی طرف رجوع کرنے کے بغیر ہے۔ انقلاب اور ذلت کے بغیر کون غلام رہ سکتا ہے؟ خُدا کی یقین دہانی کے بغیر کیسی آزادی موجود ہو سکتی ہے؟

اسی وقت ہی لغو انسان جان لیتا ہے کہ اس وقت تک وہ آزادی کی شرط کو سوچ بچار کے بغیر تسلیم کرنے پر مجبور تھا جس کی بُنیاد اُس سراب پر تھی جس پر وہ زندہ تھا۔ ایک لحاظ سے انھوں نے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ جس حد تک وہ اپنی زندگی کے مقصد کا تخیل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اُن مطالبات کے مقصد کے حصول کے مطابق تبدیل کرتا ہے اور اپنی آزادی کا غلام بن جاتا ہے۔ میں باپ کے طور پر ہی عمل کر سکتا ہوں (یا انجینیر کے طور پر یا بابائے قوم کے طور پر یا اس ڈاک خانے کے کلرک کے طور پر کام کر سکتا ہوں) جس کے لئے میں اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی اور کی بجائے اسی کے لئے منتخب کر سکتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے لاشعوری طور پر سوچتا ہوں۔ تاہم ساتھ ساتھ میں اپنے اردگرد عقائد کو انسانی ماحول کے گمان کے ساتھ ساتھ مضبوط کرتا ہوں (دوسرے آزاد ہونے کے یقین سے بھرپور ہیں اور یہ خوشگوار موڈ وبائی

ہے)۔تاہم ایک شخص اس گمان سے دور رہ سکتا ہے جو اخلاقی یا سماجی ہو سکتا ہے۔جس سے ایک شخص جزوی طور پر متاثر ہوتا ہے حتیٰ کہ اُن میں سب سے بہتر کے درمیان بھی (اچھے اور برے گمان بھی ہیں) ایک شخص اپنی زندگی ان کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔بے سروپا انسان جان لیتا ہے کہ وہ حقیقت میں آزاد نہیں ہے۔میں سچائی کے بارے میں فکر مند ہوں جو میرے لئے منفرد ہے، تخلیق کرنے یا ہونے کے طریقے کے بارے میں فکر مند ہوں، جس حد تک میں اپنی زندگی گزار سکتا ہوں اور ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اس زندگی کے معنی کو قبول کرتا ہوں۔میں اپنے لئے ایسی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں جن کے درمیان اپنی زندگی کا تعین کرتا ہوں۔میں ایسے ہی کرتا ہوں جیسے کمعڈ بیوروکریٹ کرتے ہیں جن سے میں متنفر ہوں کیونکہ ان کا شر مجھے نظر آتا ہے۔انسانی آزادی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے نہ کہ اس کے ساتھ مذاق کرنا چاہیے۔

اس مقام تک لغو انسان مجھے روشنی فراہم کرتا ہے یعنی میرا مستقبل نہیں ہوتا۔یہی میری اندرونی آزادی کا استدلال ہوتا ہے۔درویش اپنے آپ کو خُدا کے سپرد کرنے سے آزادی پاتے ہیں۔اپنے آپ کو خُدا کی راہ میں فنا کرنے کے ذریعے عارضی پابندیاں قبول کرتے ہوئے خفیہ طور پر آزاد ہو جاتے ہیں۔لیکن اس آزادی کا کیا معنی ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے متعلق آزادی محسوس کرتے ہیں لیکن اتنے آزاد نہیں ہوتے جتنا آزاد کیا جاتا ہے۔اس سے تھوڑے سے مختلف طریقے سے وہ مکمل طور پر موت کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور لغو انسان اپنے آپ میں اس جنونی توجہ کے باہر ہر شے سے آزادی محسوس کرتے ہیں جو اس کو شفاف بناتی ہے۔وہ عام قواعد سے متعلق آزادی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس مقام تک دیکھا جا سکتا ہے کہ موجودیاتی فلسفے کے ابتدائی موضوعات اپنی مکمل قدر کو برقرار رکھتے ہیں۔شعور کی طرف لوٹنا، روزمرہ کی نیند سے بچاؤ لغویتی آزادی کے پہلے مراحل کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ موجودیاتی پرچار ہے جس سے نظر چرائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ روحانی جست لگائی جاتی ہے جو بنیادی طور پر شعور سے فرار ہوتا ہے۔پرانے زمانے کے غلام اپنی

ملکیت نہ تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ جو آزادی اُن پر مشتمل ہے اس کے بھی ذمہ دار نہیں۔
موت میں بھی آقاؤں کا ہاتھ ہے جوان کو کچلتے ہوئے آزادی دلاتا ہے۔

اس بے چیندے کے یقین میں اپنے آپ کو گم کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنا نقطہ نظر وسیع کرنے کا نام دیتا ہے اور آزادی کے تصور کو شامل کرتا ہے۔ اس قسم کی آزادی اسی طرح وقت کی حد مقرر ہوتی ہے جس طرح عمل کی آزادی پر وقت کی قید ہوتی ہے۔ یہ ابدیت پر چیک نہیں لکھ سکتی۔ یہ آزادی کے سرابوں میں جگہ ضرور پا سکتی ہے جن کو موت سے روک دیا گیا تھا۔ گنہگار انسان کے سامنے خُدا کی موجودگی جیل کے دروازے مخصوص قسم کی آزادی کے لئے کھولتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ موت اور بے سر وپائی آزادی کے ایسے اصول ہیں جن کا انسان تجربہ کر سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا یہی ماحاصل ہے۔ بے سر وپا انسان جوش اور سرد، شفاف اور محدود کائنات کی نظر کو گرفت میں لیتا ہے جس میں کچھ بھی ممکن نہیں ہوتا جس سے آگے عدم اور تباہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اسی کائنات کو قبول کرتا ہے اور اپنی قوت کو اخذ کرتا ہے۔ اس کا اُمید سے انکار اور تسلی کے بغیر زندگی شہادت کے مترادف ہوتی ہے۔

ایسی کائنات میں زندگی کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ لمحے کے لئے بھی مستقبل سے کوئی شے لاتعلق نہیں رہتی اور ہر شے کو استعمال کرنے کی خواہش کرتی ہے۔ زندگی کے معنی پر یقین ہمیشہ قدروں کے پیمانے، انتخاب اور ترجیحات پر لاگو ہوتا ہے۔ ہمارے مفہوم کے مطابق لغو انسان کا یقین اس کے برعکس تبلیغ کرتا ہے۔ اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔
کیا اپیل کے بغیر ایک انسان زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں میری دلچسپی اس کو سمجھنے میں ہے۔ میں اپنی سوچ سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ زندگی کا یہ پہلو جو مجھے دیا گیا ہے کیا میں اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال سکتا ہوں؟ اب اس تشویش کا سامنا کرتے ہوئے لغو انسان پر یقین معیار کے لئے تجربات کی مقدار کے مساوی ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو قائل کرتا ہوں

کہ زندگی کا بے سر وپائی کے سوا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس توازن کا دارومدار میرے بغاوتی شعور اور اندھیرے پر ہے جس میں میں جدوجہد کرتا ہوں۔ دونوں کے درمیان مسلسل تصادم موجود رہتا ہے۔ اگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری آزادی کا مقدر کے علاوہ کوئی معنی نہیں اور ہر شے کا وزن کرتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ سب سے بہتر زندہ رہنا نہیں بلکہ حقیقی انداز میں زندہ رہنا ہے۔ یہ بغاوتی ہے یا بازاری، نفیس ہے یا شرمناک، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا؟

قدری ججمنٹ حقیقی ججمنٹ کی حمایت میں رد کر دی جاتی ہے۔ میں جو دیکھتا ہوں اسی سے نتائج اخذ کرتا ہوں۔ میں کسی بھی مفروضاتی شے کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اس طرح زندہ رہنا قابلِ تعظیم نہ تھا۔ سچی معقولیت مجھے ناقابل تعظیم کا حکم دیتی ہے۔

عام مفہوم میں زندگی کا مطلب کچھ بھی نہیں ہوتا اور اسی کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مقدار کے تصور کو مناسب انداز سے دریافت نہیں کیا گیا۔ اس میں انسانی تجربات کے بڑے حصے کو شمار کیا جاتا ہے۔ ایک انسان کا ضابطہء حیات اور اس کی قدروں کے سکیل کا تجربات کے معیار اور مقدار کے علاوہ کوئی معنی نہیں جس کو وہ اکٹھا کرنے کی پوزیشن مین ہوتا ہے۔ جدید زندگی کے حالات اکثریتی عوام پر انہی تجربات کو ٹھونستے ہیں۔ ایک فرد کی سطحی حصہ داری کو بھی غور وفکر میں شامل کرنا چاہیے جو اس کا 'دیا گیا' عنصر ہوتا ہے۔ لیکن میں اس کو جج نہیں کر سکتا اور مجھے دُہرانے دیں کہ میرا اصول شہادت کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاقیات کا عام طریقہ کار اس کے بنیادی اصولوں کی مثالی اہمیت میں مضمر نہیں ہے جیسا کسی تجربے میں ہوتا ہے جس کی پیائش ممکن ہوتی ہے۔ کسی حد تک اس نقطے کو بڑھاتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یونانیوں کے پاس اُن کی وقت گزاری کا اپنا اصول تھا جس طرح ہمارے پاس زندگی گزارنے کے لئے آٹھ گھنٹے کا اصول ہے۔ لیکن پہلے ہی بہت سے افسردہ لوگ ہمیں پیشین گوئی کرنے میں مدد دے چکے ہیں کہ طویل تجربہ قدروں کے اس ٹیبل کو تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ ہمیں تخیل کرنے میں مدد

دیتے ہیں کہ روزانہ کی مہم جوئی صرف تجربات کی مقدار کے ذریعے تمام ریکارڈ توڑ سکتی ہے اور اس طرح اپنا ضابطہ حیات بنا سکتی ہے۔ اب ہم رومانویت پسندی سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے آپ سے سوال پوچھتے ہیں کہ اس قسم کے رویے کا ایک انسان کے لئے کیا مطلب ہوسکتا ہے جس کا ذہن شرط بدنے پر تلا ہوا ہے اور سنجیدگی سے مشاہدہ کرنا کہ وہ کھیل کے قواعد بنانے کے لئے کیا اقدامات کرسکتا ہے؟

سب سے پہلے تمام ریکارڈ توڑنا جس حد تک ممکن ہو دُنیا کا سامنا کرنا ہے۔ مذاق اور تضادات کے بغیر اس کو کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ایک طرف لغوانسان سکھاتا ہے کہ تمام تجربات غیر اہم ہیں اور دوسری طرف اُکساتا ہے کہ عظیم تجربات کرنے کی ضرورت ہے۔ تب ایک شخص کیسے ناکام ہوسکتا ہے جیسے بہت سے لوگ ناکام ہوئے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ ایک طرف زندگی کی ایسی شکل کا انتخاب کرنا جو انسانی معاملات کو ہمارے سامنے لائے اور دوسری طرف ایسی قدروں کے وزن کو متعارف کرانا جن کا ایک شخص دعویٰ کرتا ہے یا جن کو رد کرتا ہے۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ یہ لغوانسان اور اس کی متضاد زندگی ہے جو ہم تک رسائی پاتی ہے۔ چونکہ غلطی اس سوچ میں ہے کہ تجربات کی مقدار کا دارومدار ہماری زندگی کے حالات پر ہے۔ ہمیں سادگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایک ہی جتنی عمر پانے والے دوانسانوں کو دُنیا تقریباً ایک ہی جیسے تجربات فراہم کرتی ہے۔ اس کا دارومدار ان پر ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں باخبر ہوں یا اپنے شعور کا سوئچ آف کرلیں۔ زندگی سے باخبر ہونے کا مطلب بغاوت اور آزادی ہے۔ جہاں پر شعور بیدار ہوتا ہے وہاں قدروں کا وزن بے کار ہوجاتا ہے۔ فرض کریں کہ ہم کہتے ہیں واحد رکاوٹ اچھائی کو اپنانے اور واحد کمی قبل از وقت موت میں ہے۔ اسی لئے لغوانسان کی نظروں میں کوئی گہرائی، کوئی جذبہ، کوئی جنون اور کوئی قربانی اہم نہیں ہوتی (خواہ وہ ایسا کرنے کی خواہش کرتا ہو) چالیس سال کی شعوری زندگی اور ساٹھ سال تک پھیلے ہوئے پاگل پن کے لئے موت ناقابلِ تلافی ہے۔ ان میں سے

انسان کسی شے کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ اس لئے لغویت اور اس میں شامل اضافی زندگی انسان کی منشاء پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس موت پر منحصر ہوتی ہے۔ الفاظ کا محتاط انداز میں استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقدر کی بات ہے۔ ایک شخص کو قسمت کے ساتھ رضامند ہونے کے قابل ہونا چاہیے۔ بیس سال کے تجربات اور زندگی کا کبھی بھی متبادل نہیں ہوتا۔

اس قسم کی چوکس دوڑ میں غیر معمولی تضاد کے بارے میں یونانیوں کا دعویٰ تھا کہ جو لوگ جوانی میں مر جاتے ہیں دیوتا اُن سے محبت کرتے ہیں۔ اس قسم کی بات تبھی سچ ثابت ہو سکتی ہے جب آپ یقین کرنے کے لئے تیار ہوں کہ دیوتاؤں کی مضحکہ خیز دُنیا میں داخل ہونے کے لئے ہمیشہ کی خوشیوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ ایک پیہم شعوری روح کے سامنے حال اور حال کا تسلسل بے سروپا انسان کا آئیڈیل ہے۔ آئیڈیل کا لفظ اس کنکشن میں غلط گونجتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ اس کا پیشہ بھی نہیں ہے بلکہ اس کے استدلال کا تیسرا ماحاصل ہے۔ غیر انسانیت کی کرب زدہ آگہی سے شروع کرتے ہوئے لغویت پر غور و فکر اس راستے کے آخر میں انسانی بغاوت کے جنونی شعلوں کے قلب کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

بے سروپائی سے میں تین نتائج اخذ کرتا ہوں یعنی میری بغاوت، میری آزادی اور میرا جنوں۔ میں صرف شعوری سرگرمی کے ذریعے موت کے دعوت نامے کو زندگی کے قاعدے میں ٹرانسفارم کر دیتا ہوں اور خودکشی سے انکار کرتا ہوں۔ میں اُس مدھم گونج کو جانتا ہوں جو ان دنوں تھرتھراہٹ پیدا کرتی تھی۔ پھر بھی میرے پاس کہنے کو الفاظ ہیں۔ جب نطشے نے لکھا تھا کہ "یہ واضح ہے کہ ارض و سماء میں اہم فرائض ایک ہی سمت میں مجموعی طور پر تابعداری پر مشتمل ہیں" جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی مصائب برداشت کرنے کے برابر ہوتی ہے مثال کے طور پر نیکی، آرٹ، میوزک، ڈانس، استدلال، ذہن۔ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو نزاکت، پاگل پن یا الوہیت کی شکل بدل دیتی ہیں۔ وہ حقیقت میں اخلاقیات کے امتیازی ضابطۂ حیات کے اصول کی تشریح کرتی ہیں۔ وہ بے سروپا انسان کے طریقہ کار کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ شعلوں کی تابعداری آسان ترین اور مشکل ترین کام ہے۔ تاہم

کبھی کبھی انسان کے لئے اپنے آپ کو جج کرنا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کے لئے تنہا ہوتا ہے۔

الین کہتا ہے ''عبادت اُس وقت ہوتی ہے جب رات کو فکر نازل ہوتی ہے۔'' لیکن ذہن کو رات کے ساتھ ملنا چاہیے۔ یہی جواب موجودیاتی دانشوروں اور صوفیوں کا ہے۔ حقیقت میں اس کا مطلب وہ رات نہیں جو آنکھوں کی پلکیں بند کرنے اور انسان کی منشاء سے پیدا ہوتی ہے۔ اندھیرا پُرسکون رات جس میں غوطہ زن ہونے کے لئے ذہن تصور کرتا ہے۔ اگر اس کو رات کا ہی سامنا کرنا ہے تو ایسی مایوسی ہونی چاہیے جو اس کو تابناک کرے۔ قطبی رات، ذہنی شب بیداری۔ وہ سفید اور پاکیزہ چمک جو ذہانت کی روشنی میں ہر شے کا خاکہ کھینچتی ہے۔ اس درجے تک مساوات جنونی فہم سے متصادم ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ موجودیاتی جست کو جج کرنے کا سوال نہیں اٹھاتی۔ یہ انسانی رویے کی عُمر رسیدہ آمیزش کے وسط میں اپنی جگہ بحال کرتی ہے۔ چونکہ تماشائی کے لئے اگر وہ آگاہ ہو تو یہ جست بھی مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ جہاں تک انسانی سوچ جاتی ہے یہ پیراڈاکس حل کرتی ہے اور اسے اصلی شکل میں بحال کرتی ہے۔ اس نقطے تک یہ معرکتہ الآرا ہے۔ اس مقام تک ہر شے اپنا مقام بحال کرتی ہے اور بے سروپا دُنیا میں اپنے تنوع اور چمک دمک میں دوبارہ پیدا ہوتی ہے۔

تاہم اسے روکنا بُرا اور سمجھنے کے لئے تضادات کے بغیر آگے بڑھنا، ایک ہی طریقے سے مطمئن کرنا مشکل ہے شاید یہ تمام روحانی قوتوں میں سب سے زیادہ دقیق ہے۔ ترجیح صرف سوچنے کے طریقے کا تعین کرتی ہے۔ لیکن اہم نقطہ زندہ رہنا ہے۔

○

لغو انسان

''اگر سٹیورو جن کو یقین ہے کہ اس کو یقین نہیں ہے۔

اگر اس کو یقین نہیں تو اس کا نہیں خیال کہ اس کو یقین نہیں'' (دی پوسیسڈ)

گوئٹے نے کہا تھا، 'وقت میرا شغل ہے۔' درحقیقت یہ ایک لغویت سے بھرپور قول ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لغو انسان کیا ہے؟ لغو انسان وہ ہے جو انکار کے بغیر خُدا کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ واپس لوٹ جانے کا روگ اس کے لئے اجنبی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ہمت اور استدلال کو ترجیح دیتا ہے۔ پہلا عمل اُسے اپیل کے بغیر زندہ رہنا سکھاتا ہے، جو کچھ اُس کے پاس ہے اس کے ساتھ آگے بڑھنا سکھاتا ہے اور دوسرا عمل اُسے حدود سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اپنی عارضی محدود آزادی، مستقبل سے محروم بغاوت اور اخلاقی شعور کی یقین دہانی کے ذریعے اپنی مُہم جوئی کو اپنی عمر کی حدود کے اندر ہی گزارتا ہے۔ یہی اُس کا دائرہ عمل ہے اور یہی اُس کا ایکشن ہے جس کو وہ اپنے قیاس کے علاوہ ڈھال فراہم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عظیم زندگی کا مطلب موت کے بعد کی زندگی نہیں ہوتا۔ اسے ناانصافی کہا جاتا ہے۔ میں یہاں پر اُس حقیر ابدیت کی بات نہیں کرتا جسے آئندہ نسل کہا جاتا ہے۔ مادام رولینڈ اپنے آپ پر بھروسہ کرتی تھی۔ یہ عاقبت نااندیش عورت سبق سکھانا چاہتی تھی۔ آئندہ نسل اُس کے ریمارکس کا حوالہ دیتے ہوئے خوش ہے لیکن اس کو سمجھنا بھول جاتی ہے۔ مادام رولینڈ کو بچوں کی پیدائش سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اخلاقیات سے چمٹے رہنے کا سوال نہیں ہے کیونکہ میں نے لوگوں کو عظیم اخلاقیات

کے ساتھ بُرا سلوک کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور میں ہر روز جائزہ لیتا ہوں کہ یک جہتی کو اصولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف اخلاقی ضابطہ حیات کافی ہوتا ہے جسے لغو انسان قبول کرسکتا ہے یعنی ایک شخص جس کو خدا سے جدا نہیں کیا جا سکتا وہ بے سروپائی کی زندگی کا شکار نہیں ہوتا۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے بے سروپا انسان کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا اور اس کے پاس جواز کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کا آغاز اُس کی معصومیت سے کرتا ہوں۔

اس معصومیت سے خوفزدہ ہونا چاہیے۔ آئیون کراموزوف دعویٰ کرتا ہے کہ 'ہر چیز جائز ہے'۔ اس بات میں بھی لغویت کی لذّت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یا نہیں کہ اس طرح جذبات کا زبردست اظہار کیا گیا ہے یا حقیقت کی تلخی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ خُدا پر یقین زندگی کو بامعنی بناتے ہوئے گناہوں پر برتری لے جاتا ہے۔ گناہ اور ثواب کے درمیان انتخاب کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ اور کوئی انتخاب ایسا نہیں ہوگا جہاں تلخی رینگتی ہوئی داخل نہ ہوتی ہو۔ بے سروپائی آزاد نہیں کراتی بلکہ باندھتی ہے۔ اس میں ہر کام جائز نہیں ہوتا۔ ہر شے کے جائز ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کسی شے کی بھی ممانعت نہیں ہے۔ بے سروپائی صرف مخصوص اعمال کے نتائج کو مساوات کہتی ہے۔ یہ جرم کی سفارش نہیں کرتی، کیونکہ ایسی سفارش بچگانہ ہوتی ہے بلکہ اس کی بے ثمریت پر ضمیر کی ملامت کو بحال کرتی ہے۔ اگر تمام تجربات لاتعلقی پر مبنی ہوں اور فرض بھی دوسرے فرائض کی طرح جائز ہوں تو ایک شخص خواہش کرنے سے ہی پاکباز ہو سکتا ہے۔

اخلاقیات کے تمام نظام اس خیال پر مبنی ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جو اُسے درست یا غلط قرار دیتا ہے۔ جس ذہن کے رگ و پے میں بے سروپائی سرایت کر گئی ہو وہ ذہن صرف جج کر سکتا ہے کہ ان نتائج پر تحمل سے غور کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا حساب بے باک کرنا چاہیے۔ اس کی رائے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو گنہگار ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کا ذہن مستقبل کے اعمال کے لئے ماضی کے تجربات کو بنیاد

بنانے پر رضامند ہوتا ہے۔ وقت ہی وقت کو طول دے سکتا ہے اور زندگی ہی زندگی کی نذر ہوسکتی ہے۔ جو میدان محدود امکانات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان کو ہر شے کی شرح نا قابل بیان معلوم ہوتی ہے۔ اُس نا معقول استدلال سے کونسا اصول ظاہر ہوتا ہے جہاں صرف سچائی سچ نظر آتی ہے یعنی یہ زندگی کو مخاطب کرتی ہے اور انسانوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ استدلال کے اختتام پر لغو ذہن اخلاقی اصولوں کی توقع نہیں کرسکتا بلکہ انسانی زندگی کی وضاحت کی توقع کرسکتا ہے۔ بے سروپائی استدلال کی خاطر گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

کیا مجھے ایسے خیال کی ضرورت ہے جس کی پیروی کی جائے کیونکہ تمام خیالات کی ہمیشہ پیروی نہیں کی جاسکتی؟ اس کے علاوہ خاص قسم کے مشاغل کی ضرورت پڑتی ہے جس کے تحت ایک انسان لغو بن سکتا ہے۔ ہم روسو سے نتیجہ اخذ کریں گے کہ ایک شخص کو باکردار ہونا چاہیے۔ جب کہ نٹشے تو یہ بھی کہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پہ مقدس ہستی سے بھی بدسلوکی کی جاسکتی۔ ایک ماڈرن مصنف لکھتا ہے کہ ایسا عمل لغویت کے لئے ضروری ہے لیکن دھوکا کھانے کے لئے ضروری نہیں۔ وہ روّیہ جس کا میں ذکر کروں گا ہم عصر دانشوروں کی سوچ کے ذریعے غوروفکر کے پورے مفہوم کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر شعور ایک جیسا ہو تو کلرک بھی فاتح جرنیل کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام تجربات بے سود ہیں۔ کچھ تجربات انسان کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں اور کچھ اُس کی خدمت میں پیش نہیں کیے جاتے۔ تجربات سے تبھی فائدہ اُٹھایا سکتا ہے جب اُن کا شعور ہو۔ ورنہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک انسان کی ناکامی ججمنٹ پر لاگو ہوتی ہے نہ کہ حالات پر بلکہ اُس کی اپنی ذات پر لاگو ہوتی ہے۔

میں اُن انسانوں کا انتخاب کر رہا ہوں جو اپنی ذات کو وسعت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں یا جن کو میں اپنے آپ کو وسعت دیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس میں مزید کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لئے میں ایک ایسی دُنیا کی بات کرنا چاہتا ہوں جس میں زندگی کی طرح فکر مستقبل سے خالی ہوتی ہے۔ جو چیز بھی انسان کو کام کرنے پر مجبور کرتی ہے یا اور جذباتی

بناتی ہے اُمید سے بھر پور ہوتی ہے۔ جو فکر بھی دروغ گوئی پر مشتمل نہیں ہوتی بانجھ ہوتی ہے۔لغو دُنیا میں ایک خیال یا زندگی کی قدر کی جانچ اس کے بانجھ پن سے ہوتی ہے۔

ڈان جون ازم

اگر محبت کرنا ہی کافی ہوتا تو کام آسان تھا۔ انسان جتنی تیزی سے محبت کرتا ہے اتنی تیزی سے بے سروپائی نشوونما پاتی ہے۔ ایسا محبت کی کمی کے باعث نہیں تھا کہ ڈان جون ایک عورت سے دوسری عورت سے رجوع کرتا تھا بلکہ کلّی محبت کی جستجو میں ایسا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لئے اسے صوفیوں سے ملانا لغویات ہے۔ حقیقت میں وہ ہر عورت سے اُسی جنوں کے ساتھ محبت کرتا تھا جس جنوں کے ساتھ پہلی عورت سے محبت کرتا تھا۔ ہر دفعہ وہ گہری محبت کرتا ہے تاکہ وہ اپنے تحفے کو دہرا سکے اور جستجو کو گہرا کر سکے۔ ہر عورت اُسے وہ کچھ دے سکے جو آج تک اُسے کوئی عورت بھی نہیں دے سکی۔ ہر دفعہ وہ کلّی طور غلط ہوتی ہیں اور اسے تکرار کی ضرورت کو صرف محسوس کروا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک دعویٰ کرتی ہے، 'آخر کار میں نے آپ کو اپنی محبت دی ہے۔' کیا ہم حیران ہیں کہ ڈان جون نے اس پر مسکراہٹ کا اظہار کیا ہوگا؟ اس کی بجائے وہ کہتا ہے، 'آخر کار نہیں، بلکہ ایک دفعہ پھر۔' زیادہ محبت کرنے کے لئے کبھی کبھار محبت کرنا ہی ناگزیر کیوں ہوتا ہے؟

کیا ڈان جون افسردہ ہے؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ میں تو محض اس سورما کا ذکر کر رہا ہوں۔ تھیٹر کی اُس مسکراہٹ اور فاتحانہ گستاخی کا ذکر جو چنچل، واضح اور لطیف ہے۔ ہر صحت مند مخلوق اپنے آپ کو ضرب دینے کا رجحان رکھتی ہے۔ ایسا ہی ڈان جون کے ساتھ ہوا۔ لوگوں کے افسردہ ہونے کی دو وجوہات ہوتی ہیں یعنی یا وہ جانتے نہیں یا پُر اُمید ہیں۔ ڈان جون جانتا ہے اور پُر اُمید نہیں۔ وہ آرٹسٹوں میں سے ایک آرٹسٹ کو یاد کرتا ہے جو اپنی حدود جانتا ہے اور ان سے آگے نہیں جاتا۔ وہ اس غیر اختیاری وقفے میں فن دانوں کی حیرت انگیز

راحت سے لطف اندوز ہوتا ہے جس میں وہ روحانی اثرات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہی دانا انسان ہے یعنی ایسی دانائی جو اپنی حدود جانتی ہے۔ جسمانی حدود کی موت تک ڈان جون افسردگی سے غافل رہا۔ جس عورت کو وہ جانتا ہے، اس کی مسکراہٹ انسان کو ہر شے بھلا سکتی ہے۔ وہ جب اُمید کرتا ہے افسردہ ہو جاتا ہے۔ آج اُس عورت کے منہ پر علم کے تلخ اور اطمینان بخش ذائقے کو تسلیم کرتا ہے۔ صرف تلخی؟ یعنی وہ ادھورا پن جو خوشی کو قابلِ ادراک بناتا ہے۔

ڈان جون کو ایسے پرہیزگار کے طور پر لینا جس کی چرچ میں پرورش ہوئی ہو غلطی ہے؟ اس کے نزدیک جنّت کی اُمید جھوٹ ہے۔۔ وہ بذاتِ خود جنت کے خلاف اس زندگی کا جوا کھیلتا ہے۔ خواہش کی آرزو کو تسکین کے ذریعے قتل کرتا ہے۔ نامرد آدمی کی سُنی سنائی باتوں پر غور نہیں کرتا۔ فاسٹ کے لئے اس قسم کی باتیں درست ہیں جو خُدا پر اتنا یقین رکھتا تھا کہ اپنے آپ کو شر کے سامنے بیچ سکے۔ ڈان جون کے نزدیک سادہ سی بات ہے۔

مولینا کا برلادار [Molina's 'Burlador'] دوزخ کی دھمکیوں کا جواب دیتی ہے، 'آپ اس کے علاوہ مجھے کیا دے سکتے ہیں؟' موت کے بعد جو بھی ہوگا بے کار ہے۔ وقت کا یہ تسلسل جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ کیسے زندہ رہنا ہے! فاسٹ نے دُنیاوی چیزوں کو تخلیق کیا، غریب آدمی صرف اپنے ہی ہاتھوں میں کھجلی کر سکتا ہے۔ جب وہ اپنی روح کو خوش کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو پہلے ہی اس کو بیچنے کے لئے حساب لگاتا ہے۔ تسلّی کے لئے ڈان جون اس پر اصرار کرتا ہے۔ اگر وہ ایک عورت کو چھوڑتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ دوبارہ کبھی اس کی خواہش نہیں کرتا بلکہ خوبصورت عورت کی ہمیشہ خواہش کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ دوسری عورت کی خواہش کرتا ہے جو پہلی جیسی نہیں ہوتی۔ زندگی ہر خواہش کی تسکین چاہتی ہے اور اس کو کھونے کے علاوہ کوئی شے نہیں ہے۔

پاگل انسان سب سے زیادہ عقل مند ہے۔ جو اس کائنات میں اُمید پر زندہ ہے جہاں رحم دلی، سخاوت، عشق مردانہ، خاموشی اور رفاقت گوشہ نشین جرأت کی طرف لپکتی ہیں۔

تمام لوگ یہ کہنے میں عجلت کرتے ہیں کہ وہ ضعیف، خیالیت پسند یا درویش تھا۔ ایسا کہتے ہوئے ایک شخص کی تکریم کو بدنام کرنا ہے۔

لوگ ڈان جون کی تقریروں سے ناراض ہیں (یا اس مسکراہٹ سے جو ساز باز کی مسکراہٹ ہے، جس کی مدح سرائی کرتی ہے اسی کی قدر گھٹا دیتی ہے) اور اُسی ایک ریمارکس پر جو وہ تمام عورتوں کے لئے کہتا ہے۔ جو شخص بھی اس کی خوشی میں مقدار کا متلاشی ہے وہ اس میں موثر پن کو پاتا ہے۔ اُن شناختی الفاظ کو پیچیدہ بنانے سے کیا ہوتا ہے جو امتحان کے طور پر سامنے آتے ہیں؟ کوئی شخص بھی دیکھنے کے لئے نہیں آتا بلکہ اُس آواز کو سننے کے لئے آتا ہے جو اس کو ادا کرتی ہے۔ یہ اصول ہے، عہد ہے اور خوش خُلقی ہے۔ جب یہ الفاظ ادا کر دیے جاتے ہیں تو سب سے اہم بات کا ذکر رہ جاتا ہے۔ ڈان جون پہلے ہی اس کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اخلاقیات کے چکر میں نہیں پھنساتا؟ وہ میلوز منرا [miloz's Manara] کی طرح نہیں جو اپنے آپ پر درویش ہونے کے ذریعے لعن طعن کرتی ہے۔ اس کے لئے دوزخ کو طیش دلایا جاتا ہے۔ خدائی غضب کا صرف انسانی عظمت میں جواب دیا جاتا ہے یعنی وہ کمانڈر سے کہتا ہے کہ میں صاحب عزت ہوں، اپنے وعدے کی پاسداری کرتا ہوں کیونکہ میں ایک سورما ہوں۔ لہٰذا مجھے بدکار سمجھنا غلطی ہوگی۔ اس لحاظ سے وہ عام شخص کی طرح ہے یعنی اس کا پسند اور ناپسند کا اخلاقی ضابطہ ہے۔ ڈان جون کو مختلف حوالہ جات سے سمجھا جا سکتا ہے یعنی عیاش، زانی اور جنسی اتھلیٹ کے طور پر۔ وہ عورتوں کو پھانسنے والا معمولی عاشق معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس کا شعور رکھتا ہے اسی لئے لغویت کا شکار ہے۔ وہ پھسلانے والا عاشق اپنے عمل کا جواز جانتا ہے اور کبھی تبدیل نہیں ہوگا۔ پھسلانا اُس کی زندگی کا جواز ہے۔ صرف ناولوں میں ایک شخص حالات کو تبدیل کر سکتا ہے یا ان کو بہتر بنا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوتا اور ہر شے کو ٹرانسفارم کر دیا جاتا ہے۔ ڈان جون جو کچھ اخلاقیات سے سمجھتا ہے اسے معیار کہتا ہے۔

اس کے برعکس ایک ولی مقدار کی بات کرتا ہے۔ چیزوں کی غرض وغایت پر یقین نہ کرنا بے سروپا انسان کی عادت ہوتی ہے۔ جہاں تک پرتپاک یا حیرت زدہ چہروں کا تعلق ہے وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے، ان کو آنکھوں میں بساتا ہے اور ان پر افسوس نہیں کرتا۔ وقت ان کے ساتھ بدستور بہتا رہتا ہے۔ بے سروپا انسان وہ ہے جو وقت سے جُدا نہیں ہوتا۔ ڈان جون عورتوں کو 'اکٹھا' کرنے کا نہیں سوچتا۔ وہ ان کی تعداد کو ختم کر دیتا ہے اور اسی کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے مواقع بھی ختم کر دیتا ہے۔ 'اکٹھا کرنے' کو شمار کرنا گزرے ہوئے ماضی پر زندہ رہنے کے قابل ہونا ہے۔ وہ افسوس کرتا ہے جو اُمید کی دوسری شکل ہے۔ وہ تصویروں کی طرف دیکھنے کا قائل نہیں۔

کیا اِن وجوہات کی بناء پر اسے خودغرض کہا جا سکتا ہے؟ شاید اس راستے پر چلنے والے کو خودغرض کہا جا سکتا ہو۔ اسے سمجھنا ضروری ہے۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کم از کم ڈان جون ایسا کہنا چاہتا ہوگا۔ اُس نے چند الفاظ میں ایسا کہا تھا کیونکہ وہ انتخاب کر سکتا تھا۔ وہ محبت جس کی ہم یہاں بات کر رہے ہیں ابدیت کے سرابوں میں ملبوس ہے۔ عشق کے تمام ماہرین ہمیں سکھاتے ہیں کہ خدائی محبت ایسی شئے نہیں جس کو دبایا جائے۔ جدوجہد کے بغیر شاید ہی کوئی محبت ہو۔ اس قسم کی محبت آخرکار موت کے تضاد پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ایک شخص کو یا تو قابلِ وقعت ہونا چاہیے یا بے وقعت ہونا چاہیے۔ خودکشی کے دوسرے طریقے بھی ہیں جس میں سے ایک طریقہ اپنی ذات کو نظرانداز کرنا ہے۔ کسی بھی شخص کی طرح ڈان جون بھی جانتا ہے کہ اس کو جُنبش دینے سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جو جانتے ہیں کہ یہ اہم نہیں ہے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح جانتا ہے کہ جو لوگوں کی خاطر اپنی ذاتی زندگی سے رُخ موڑ لیتے ہیں شاید اپنے آپ کو زرخیز کرتے ہیں لیکن یہی محبت اُن کو کنگال کرتی ہے جو اس کو منتخب کرتے ہیں۔ ایک ماں یا محبت میں گرفتار بیوی کا دل بند ہوتا

ہے کیونکہ وہ دُنیا سے منہ موڑ لیتی ہے۔ ایک ہی جذبہ، ایک ہی مخلوق، ایک ہی چہرہ سب کچھ کھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ محبت کا تصور ڈان جون کو پریشان کرتا ہے جو آزادی بخش ہے۔ یہ اپنے ساتھ تمام چہروں کو دُنیا میں لاتا ہے اور اس کی کپکپی اس چہرے سے آتی ہے جو اپنے آپ کو فانی سمجھتا ہے۔ ڈان جون لاشے کا انتخاب کرتا ہے۔

اس کو واضح طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم اسی کو محبت کہتے ہیں جس کی خاطر ہمیں مخصوص مخلوق کے ساتھ باندھنے کے لئے اجتماعی طور پر کتابوں اور سورموں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ محبت کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ یہ خواہش، جنوں اور ذہانت کا ملاپ ہے جو مجھے خاص مخلوق سے باندھتی ہے۔ یہ تصفیہ دوسرے شخص کے لئے نہیں ہے۔ مجھے ایک ہی نام سے تمام تجربات کو اکٹھا کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ ایک شخص کو انہی اشارات سے مستثنیٰ کرتا ہے۔ بے سروپا انسان جس کو اکٹھا نہیں کرسکتا اس کو ضرب دیتا ہے۔ وہ ہستی کے ایک نئے طریقے کو دریافت کرتا ہے جو اسے کم از کم اتنا آزاد کرتا ہے جتنا وہ اُن کو آزاد کرتا ہے جو اُن تک رسائی کرتا ہے۔ شاندار محبت کوئی شے نہیں ہے سوائے اس کے جو اسے مستثنیٰ اور قلیل الحیات کے طور پر پہچان کرتی ہے۔ تمام اموات اور پیدائشِ نو ایک ہی گٹھے میں بند کردیئے گئے ہیں جو ڈان جون کے لئے زندگی کا گلدستہ بنتے ہیں۔ یہ اُس کا قوتِ حیات اور زندگی میں تروتازگی کا طریقہ ہے۔ میں ایک شخص کو فیصلہ کا اختیار دیتا ہوں خواہ اسے خودغرض کہے یا نہ کہے۔

میں اس نقطے پر اُن تمام لوگوں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں جو آزادانہ طور پر اصرار کرتے ہیں کہ ڈان جون کو نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دُنیا میں بھی سزا ملنی چاہیے۔ میں بوڑھے ڈان جون کے بارے میں تمام کہانیوں، کہاوتوں اور مسکراہٹوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ڈان جون پہلے ہی تیار ہے۔ شعوری انسان کے لئے بوڑھی عمر اور جو کچھ اس کے لئے نشانی ہے تحفہ نہیں ہوتی۔ درحقیقت وہ اس حد تک باخبر ہے جس حد تک وہ اپنے

آپ سے دہشت کو چھپا نہیں سکتا۔ ایتھنز میں ایک ٹیمپل بوڑھے انسانوں کے لیے وقف تھا۔ بچوں کو وہاں پر لے جایا جاتا تھا۔ جتنا زیادہ لوگ ڈان جون پر ہنستے ہیں اُس کی شخصیت اُتنی بلند ہوتی ہے۔ اس لئے وہ رومانویت پسندوں کو رد کرتا ہے جو مجاہدہ نفس کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ڈان جون پر نہیں ہنستا۔ اس پر ترس کھایا جاتا ہے۔ بذاتِ خود آسمان ہی اُسے نجات دلاتا ہے۔

لیکن یہ بات کافی نہیں ہے۔ ڈان جون کے نزدیک اس کائنات کی جھلک مضحکہ خیزی کو شامل کرتی ہے۔ وہ پاکباز ہونے کو نارمل خیال کرتا ہے۔ یہی کھیل کا اصول ہے۔ درحقیقت کھیل کے تمام قواعد کو قبول کرنے کی شرافت کا حصہ ہے۔ پھر بھی وہ جانتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قسمت سزا نہیں۔ یہی اس کا جُرم ہے اور یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ خدا کے بندے اس کو سزا دینے کے بارے میں کیوں مشتعل ہوتے ہیں۔ وہ سراب کے بغیر علم کو حاصل کرتا ہے جو ہر اس شے کی نفی کرتا ہے جس کا اقرار کیا جاتا ہے۔ محبت کرنا اور ملکیت جتانا، فتح کرنا اور صرف کرنا۔۔۔ جاننے کے طریقے ہیں۔ وہ اس حد تک اُن کا بدترین دشمن ہے کہ وہ ان سے غافل ہے۔ واقعہ نگار بیان کرتا ہے کہ سچا 'حمایتی' فرانسیسیوں نے قتل کر دیا تھا جو ڈان جون پر کفر کے فتووں کا اختتام چاہتا تھا اور اس کی بریت کی یقین دہانی چاہتا تھا۔ پھر اعلان کیا گیا کہ فلک کے نیچے اسے ڈھیر کر دیا گیا۔ کوئی بھی اس عجیب اختتام کو ثابت نہ کر سکا، نہ ہی اس کے برعکس کوئی ثابت کر سکا۔ لیکن کسی حیرت کے بغیر اگر یہ قیاس کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ منطقی ہے۔ میں اس نقطے پر اس لفظ 'پیدائش' کا انتخاب کرتا ہوں اور الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہوں یعنی یہ زندہ رہنے کی حقیقت تھی جس نے اُس کی معصومیت کو یقینی بنایا۔ صرف تنہا موت سے ہی اُس نے احساسِ گنہگاری اخذ کیا تھا جس نے اُسے لیجنڈ بنا دیا۔

اس پتھر دل کمانڈر کا مطلب ہے وہ سرد مہر مجسمہ جو جرأت اور قربانی کو سزا دینے کے لئے حرکت میں آنے کا سوچتا ہے؟ خدائی منطق، عالمی اخلاقیاتی نظام اور خدا کی اجنبی

شان وشوکت کی تمام قوتیں غیض وغضب کے لئے تیار ہیں جن کا خلاصہ کیا جاتا ہے۔ وہ عظیم اور بے روح پتھر صرف اُن قوتوں کی علامت ہے جن کی ڈان جون ہمیشہ کے لئے مخالفت کرتا ہے۔

یہاں پر کمانڈر کا مشن رک جاتا ہے۔ جب دعوت دی جاتی ہے تو گرج اور چمک عرشِ بریں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ان سے الگ حقیقی ٹریجڈی واقع ہوتی ہے۔ پتھریلے ہاتھ کے ماتحت ڈان جون کی موت سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں اس بہادر سورما کا معترف ہوں اس صحت مند انسان کے پاگل قہقہے کا جو موجود نہ ہونے والے خُدا کو مشتعل کرتا ہے۔ لیکن سب سے بالاتر میرا یقین ہے کہ اس شام جب ڈان جون انا کے ہاں انتظار کر رہا تھا کمانڈر نہیں آیا اور اس اندھیری رات کے بعد کفر بکنے والے کو اُن کی دہشت ناک تلخی محسوس ہوئی۔ جو حق پر تھی۔ حتیٰ کہ میں اس کی زندگی کے اعمال کو قبول کر سکتا ہوں جو اُس کے ساتھ ہی قبرستان میں دفن ہیں۔ شاید کہانی کے صرف اسی اخلاقی پہلو پر ہی غور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خُدا سے کس قسم کی پناہ مانگ سکتا ہے؟ لیکن یہ بات مکمل طور پر زندگی کے منطقی ماحاصل کو ظاہر کرتی ہے جو بے سروپائی سے شرابور ہے اور ایک ہستی کا سنگدل اختتام مختصر خوشیوں کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس نقطے پر شہوت پرستی سے بھرپور خوشی شک پرستی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ ایسے ہوں جیسے تھے وہ ایک ہی جیسی محتاجی کے دو پہلو تھے۔ اُس شخص کی بجائے اور کون سی ڈراونی شکل یاد کی جا سکتی ہے جس کے جسم کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا ہو۔ صرف اس وجہ سے وہ وقت پر فوت نہیں ہوا تھا۔ وہ موت کے انتظار میں زندگی گزارتا رہا۔ اس خدا کے سامنے جس کی عزت نہیں کرتا تھا اور غلامانہ طور پر اس کی خدمت نہیں کرتا تھا۔ اس خدا کے سامنے جھکتے ہوئے عرشِ بریں کی طرف خوش الہانی کے بغیر پھیلے ہوئے ہاتھ جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ گہرائی کے بغیر ہیں۔

میں ڈان جون کو اُن ہسپانوی خانقاہوں میں سے ایک خانقاہ میں دیکھتا ہوں۔ جو پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہے۔ اگر وہ کسی شے پر غور کرتا تھا تو وہ ماضی کی محبت کے بھوت نہ

تھے بلکہ سورج کی تپش سے پکی ہوئی دیوار کی دراڑ میں سے نظر آتی ہوئی خاموش ہسپانوی میدانی بے روح دھرتی تھی جس میں وہ اپنے آپ کو پہچانتا تھا۔ اُس غمگین اور روشن شبیہ پر پردے گر جانے چاہئیں تھے۔ اس کا خود بخود اختتام منتظر تھا لیکن اس کی خواہش نہیں کی جاتی تھی اور حتمی اختتام برائے نام تھا۔

ڈرامہ

ہیملٹ کہتا ہے کہ 'ڈرامہ ہی وہ چیز ہے جہاں پر میں بادشاہ کے شعور کو گرفت میں لے سکتا ہوں۔' گرفت میں لینا ہی اصل لفظ ہے۔ چونکہ شعور اپنے آپ میں تیزی سے حرکت کرتا ہے یا اپنے آپ میں پسپا ہو جاتا ہے۔ اس کو ایسے وقت پر پکڑنا چاہیے جب یہ اپنے آپ کا ادراک کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے اُچٹتی نظر ڈالتا ہے۔ عام انسان انتظار پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اُس کو ہر شے آگے کی طرف دھکیلتی ہے۔ لیکن اس وقت اُس کو اپنی ذات کے علاوہ خاص طور پر اپنے کارناموں کے علاوہ کوئی شے دلچسپ نظر نہیں آتی۔۔ چنانچہ اگر اس کی تھیٹر یا فلم میں دلچسپی ہو تو اس میں بہت سے کردار دیکھے جا سکتے ہیں جہاں پر وہ افسوس کے بغیر شاعری کو قبول کر سکتا ہے۔ کم از کم یہاں پر بے فکرے انسان کی پہچان کی جا سکتی ہے اور وہ ایک اُمید کی طرف چلنا جاری رکھتا ہے۔ بے سروپا انسان وہاں سے سفر کا آغاز کرتا ہے جہاں پر ایک شخص اپنا راستہ ترک کرتا ہے۔ ڈرامے کی تعریف کرنا ٹر کے ہوئے ذہن میں ہل چل پیدا کرنا ہے۔ زندگی میں داخل ہونے کے لئے ان کے اختلافات کا تجربہ کرنا ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عام طور پر اداکار اس جبلت کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ وہ بے سروپا لوگ ہیں تاہم اُن کی قسمت ایک بے سروپائی قسمت ہے جو ایک روشن دل کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ جس چیز کی ہم پیروی کریں گے اس کو غلط فہمی کے بغیر اپنی گرفت میں لینے کے لئے اس سلسلے کو قائم کرنا پڑے گا۔

ایکٹر کا حلقہء اثر تیزی سے گزر جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی شہرت چند روزہ ہوتی ہے۔ کم از کم اس کا گفتگو میں ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ ہر قسم کی شہرت چند روزہ ہی ہوتی ہے۔ سیریلس کے مطابق دس ہزار سالوں میں گوئٹے کا کام خاک ہو جائے گا اور اس کا نام بھلا دیا جائے گا۔ شاید چند آثار قدیمہ کے ماہرین اس عہد کی 'شہادت' دیں گے۔ یہ خیال ہمیشہ ایک سبق پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس پر سنجیدگی سے غور وفکر کیا جاتا ہے۔ جو ہماری بے قراری کو عالی ظرفی تک گھٹا دیتا ہے جس میں لاتعلقی پائی جاتی ہے۔ سب سے بالاتر ہماری تشویش کا رخ یقیناً غور وفکر کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ تمام شہرتوں میں کم سے کم دھوکے والی وہ شہرت ہوتی ہے جو زندہ رہتی ہے۔

اداکار شہرت کا انتخاب کرتا ہے وہ شہرت جس کو کھایا جاتا ہے اور ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ ایک دن ہر شے مر جائے گی سب سے بہتر نتائج سامنے لاتی ہے۔ ایک اداکار کامیاب یا ناکام ہوتا ہے۔ ایک مصنّف کو پھر بھی اُمید ہوتی ہے اگر اس کے فن پاروں کو نہ سراہا جائے۔ وہ فرض کرتا ہے کہ اس کا کام اس حقیقت کا گواہ رہے گا کہ وہ کیا تھا۔ جب ایکٹر ہمارے لئے فوٹوگراف چھوڑتا ہے اور کوئی ایسی شے نہیں چھوڑتا جس سے ہم اندازہ لگا سکیں کہ وہ خود کیا تھا، اس کے انداز اور اس کی خاموشیاں، محبت کی خاطر ہانپنا اور تڑپنا کچھ بھی بعد کے زمانے تک نہیں پہنچتا۔ اس کے نزدیک مشہور نہ ہونے کا مطلب عمل نہ کرنا اور عمل نہ کرنا تمام حشرات کے ساتھ سینکڑوں دفعہ مرنا ہے جن کو وہ زندگی بخشنے کا باعث بناتا یا دوبارہ زندہ کرتا ہے۔

تخلیقات میں سب سے زیادہ عارضیت پر مبنی تخلیق تیزی سے ختم ہونے والی شہرت پر ہمیں حیران کیوں ہونا چاہیے؟ ایکٹر کے پاس اپنی شہرت کو نمایاں کرنے کے تین گھنٹے ہوتے ہیں۔ وہ اس تھوڑے سے وقت میں پچاس مربع فٹ کے اسٹیج پر کرداروں کو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ کسی نے کبھی بھی بے سروپائی کو اتنے اچھے طریقے سے بیان نہیں کیا۔ اس

شاندار زندگی کے علاوہ کیا تخیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ غیر معمولی اور مجموعی مقدر جو اسٹیج کے اندر چند گھنٹوں کے لئے واضح ہوتا ہے۔ اسٹیج کے نیچے اداکار کو کوئی نہیں پوچھتا اور دو گھنٹے بعد ہی وہ گھر سے باہر کھانا کھا رہا ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ زندگی خواب ہے۔ غیر یقینی صورتِ حال میں مبتلا ہیرو جب دوبارہ آتا ہے تو انتقام سے چنگھاڑ رہا ہوتا ہے۔ صدیوں کے ذہنوں کی سبک رفتاری کے ذریعے اس بے سروپا انسان اور دوسرے پردیسی اور انفرادی لوگوں میں بہت سی اقدار مشترک ہوتی ہیں۔ وہ ہر شے کی نکاسی کرتا ہے اور مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ وہ وقت کے اندر ایک مسافر ہے، بلکہ وہ ایسا شکاری مسافر ہے جو روحوں کا متلاشی ہے۔ اگر کبھی مقداری اخلاقیات اپنی غذائیت پا سکی تو حقیقت میں اسی اسٹیج پر پائے گی۔ ان کرداروں سے ایک ایکٹر کس حد تک فائدہ اُٹھا سکتا ہے اس کے بارے میں کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ صرف جاننے کی بات ہے کہ کس حد تک وہ اپنے آپ کو اُس ناقابلِ تلافی زندگی کا متبادل سمجھتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہی اُن کو لاتا ہے کہ وہ کس حد تک زماں اور مکاں سے چھلکنا شروع کر دیتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایکٹر کی رفاقت میں ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس سے جدا نہیں کر سکتا جو وہ خود ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب وہ اپنے جام کی طرف بڑھتا ہے تو ہیملٹ کا انداز اپناتے ہوئے جام اُٹھاتا ہے۔ نہیں، یہ فاصلہ جو اسے اُس مخلوق کی طرف سے جُدا کرتا ہے جن کو وہ زندگی دینے سے انکار کرتا ہے اتنا اہم نہیں۔ وہ کثرت کے ساتھ ہر دن مثال پیش کرتا ہے کہ اس کے درمیان کوئی سرحد نہیں ہے کہ ایک شخص کیا چاہتا ہے اور ایک شخص کیا ہے۔ بہتر نمائندگی کے بارے میں پریشان ہوتے ہوئے وہ اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کیسے ظاہریت وجود کو جنم دے سکتی ہے۔ یہی اس کا آرٹ ہے۔ آخر میں اس کا پیشہ واضح ہو جاتا ہے یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر دل و جان سے اس وجود پر لاگو کرنا جو کچھ بھی نہیں ہے یا سب کچھ ہے۔ جتنی حدود اُسے الاٹ کی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنا کردار تخلیق کر سکے اُتنا ہی اس کی صلاحیت ضروری ہوتی ہے۔ آج جو اس نے نقاب اوڑھا ہے اس کے نیچے وہ تین گھنٹے

بعد مر جائے گا۔ایک شخص کو پانے کے لئے ایک شخص بننا اسی کو کہا جاتا ہے۔ ان تین گھنٹوں میں وہ راستے کی آخری منزل تک جاتا ہے جب کہ سامعین میں سے ایک شخص کو اس کے لئے پوری زندگی درکار ہوتی ہے۔

عارضی طور پر وقت کی نقل کے لئے اداکار اپنے آپ کو اسٹیج پر ظاہر کرنے کے لئے اپنی تربیت کرتا ہے اور اپنی تکمیل کرتا ہے۔تھیٹر کا کنونشن یہ ہے کہ دل صرف اپنے جسم اور انداز کے ذریعے اپنے آپ کے ساتھ ابلاغ کرے اور اپنا اظہار کرے۔یا اس آواز کے ذریعے اظہار کرے جو جتنی روح کے لئے اہم ہے اتنی ہی جسم کے لئے اہم ہے۔آرٹ کا اصول اصرار کرتا ہے کہ ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے اور اس کا ترجمہ انسانی جسم کی ظاہری شکل میں کرنا چاہیے۔اگر اسٹیج پر ممکن ہوتا کہ اسی طرح محبت کی جائے جس طرح لوگ محبت کرتے ہیں اور دل کی اس نا قابلِ تلافی آواز کو استعمال کیا جائے تا کہ انسان ایسا نظر آئے جیسا لوگ زندگی میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہماری تقریر کوڈ میں ہونی چاہیے تھی۔لیکن یہاں پر خاموشیوں کو سُننا چاہیے۔آواز زیادہ اونچی آواز میں ہوتی ہے اور بذاتِ خود غیر حرکتی قابلِ تماشا بن جاتی ہے۔جسم بادشاہ ہے۔ہر کوئی تھیٹر کا ماہر نہیں بن سکتا اور یہ غیر منصف تہمت زدہ لفظ پورے اخلاقی اور جمالیاتی پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔انسان کی آدھی زندگی رُخ موڑتے ہوئے اور خاموشی اختیار کرتے ہوئے گذر جاتی ہے۔یہاں پر اداکار حملہ آور ہوتا ہے۔وہ اس سحر کو توڑ دیتا ہے جو روح کو جکڑ لیتی ہے۔اور کم از کم جنوں اُن کے اسٹیج کی طرف دوڑتا ہے۔وہ ہر انداز میں بولتا ہے۔وہ صرف چیخ و پکار کے ذریعے زندہ رہ سکتا ہے۔اس طرح ایکٹر نمائش کے لئے اپنا کردار تخلیق کرتا ہے۔وہ ان کا خاکہ بناتا ہے یا سنگ تراشی کرتا ہے اور اُن کی تخیلاتی شکل میں پھسل جاتا ہے اُن کی خیالی صورت میں اپنے خون کو منتقل کرتا ہے۔البتہ میں عظیم ڈرامے کی بات کر رہا ہوں ایک اسی قسم کی جو ایک ایکٹر کو موقع فراہم کرتا ہے تا کہ وہ اپنی قسمت آزما سکے۔مثال کے طور پر شیکسپیر کو لیں۔اُس محرک ڈرامے میں جسمانی

جنوں رقص کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ہر چیز کی وضاحت کرتا ہے۔ اُس کے بغیر سب کچھ دھڑام سے گر جاتا ہے۔ کنگ لیر [King Lear] اُس اشارے کے ذریعے پاگل پن کا تعین نہیں کرتا جس میں ایڈگر کی ملامت کی جاتی ہے اور کارڈیلیا کو در بدر کیا جاتا ہے۔ اسی ٹریجڈی کو نمایاں کرنے کے لیے پاگل پن کے رویے کو غالب کیا جاتا ہے۔ روحیں اور دیوتا اُن کے ڈانسوں کے سامنے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ چار ایسے انسانوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں سے ایک تجارت، ایک ارادے اور دو مصائب کے ذریعے پاگل ہو جاتے ہیں۔ چار بے ترتیب اجسام اور ایک ہی حالت کے چار نا قابلِ بیان پہلو اس ٹریجڈی کا حصہ ہیں۔

ماسک اور اونچی ایڑی والے جوتے، میک اپ کیے ہوئے چہرے چمک دمک کے ساتھ پیش ہوتے ہیں۔ وہ وضع قطع جو مبالغہ کرتی ہے اور سادگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ کائنات جو ہر شے کو ظاہریت تک محدود کر دیتی ہے اور صرف دیکھنے کی حد تک بنائی جاتی ہے۔ ایک بے سروپائی معجزے کے ذریعے یہ جسم ہے جو علم کو لاتا ہے۔ میں ایک ڈرامے کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک اس میں اہم کردار ادا نہیں کرتا۔ اسے سُننا کافی نہیں ہوتا، کیونکہ میں اس کو اُسی وقت گرفت میں لے سکتا ہوں جب میں اسے دیکھتا ہوں۔ ایک بے سروپائی کردار کے طور پر اداکار یکسانیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ جابرانہ خاکہ جو عجیب و غریب بھی ہے اور مانوس بھی معلوم ہوتا ہے جس کو ایک ہیرو سے دوسرے ہیرو میں اپنا کردار تبدیل کرنا ہوتا ہے۔

یہ عظیم ڈرامائی کردار اور لہجے اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر کردار اپنے آپ کا تضاد پیش کرتا ہے۔ یعنی ایک ہی جیسا لیکن پھر بھی مختلف اتنی زیادہ روحوں کو ایک ہی جسم میں سمو دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لغویت کا شکار ہو جاتا ہے۔ لغویت جو اپنے آپ کا تضاد ہوتی ہے۔ وہ فرد جو ہر شے کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ بے کار کوشش اور غیر موثر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جو شے اپنا ہی

تضاد پیش کرتی ہے اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ اسی مقام پر ہے جہاں پر جسم اور روح کا احاطہ کیا جاتا ہے، جہاں پر ذہن اپنی شکست سے تھک کر اپنے سب سے زیادہ وفادار اتحادی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ہیملٹ کہتا ہے کہ 'وہ لوگ سب سے متبرک ہیں جن کا خون اور ججمنٹ گڈ مڈ ہیں جو ایک نجومی کے قرنے پر رکھی ہوئی انگلی نہیں ہے جسے جب ضرورت ہو چپ کرایا جا سکتا ہو۔'

ایک اداکار کی اس قسم کی اداکاری کی مذمت کرنے سے چرچ کیسے باز رہ سکتا تھا؟ اس نے اس آرٹ کو تسلیم ہی نہیں کیا جو بدعتی روحوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے، جذبات کو بہکاتا ہے اور ذہن کا اہانت آمیز غرور پیش کرتا ہے، جو ایک زندگی گزارنے پر اعتراض کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہر قسم کی زیادتی میں دھکیل دیتا ہے۔ چرچ اُن میں حال کی ترجیحات اور تغیر پذیر انسان کی فتح کو قانونی طور پر خارج کر دیتا ہے جو ہر شے کی نفی ہے جس کا یہ پرچار کرتا ہے۔ دوام ایک کھیل نہیں۔ ایک ذہن ہی دوام پر کامیڈی کو ترجیح دینے کی حماقت کر سکتا ہے جو اپنی نجات کے راستے بند کر چکا ہے۔ 'ہر طرف' اور 'ہمیشہ' کے درمیان کوئی موازنہ نہیں ہے۔ جب کہ وہ موذی پیشہ ایک ہولناک روحانی تصادم کی طرف اُبھرتا ہے۔ نٹشے نے کہا تھا، 'جس بات کو خاطر میں لایا جاتا ہے وہ ابدی زندگی نہیں بلکہ ابدی جوشیلا پن ہے۔' اس لئے تمام ڈرامے اس انتخاب پر ختم ہوتے ہیں۔

ایڈرینی [Adrienne Lecouvreur] موت کے بستر پر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور مذہبی حلقے میں شامل ہونے کو تیار تھی لیکن اُس نے اپنے اعتراف کے بعد توبہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے وہ اعتراف کرنے کی رحمت سے بھی محروم رہی۔ کیا اُس کا فطرت کو ترجیح دینے کی بجائے اپنے جنوں کو ترجیح دینا چاہیے۔ اُس خاتون نے انتہائی کرب میں بستر مرگ پر بیٹھے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جسے وہ آرٹ کہتی تھی جس نے اُسے عظیم ہونے کا ثبوت دیا تھا جس نے تھیٹر کی عظمت کو اس

روشنیوں میں حاصل نہیں کیا تھا۔ جنت اور بے سروپائی کے ساتھ نمک حلالی کے درمیان انتخاب کرتے ہوئے ایک شخص اپنے آپ کے لئے دوام کو ترجیح دیتا ہے یا خدا کے سامنے گم ہو جاتا ہے اور یہی المیہ ہے جس میں ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اس عہد کے اداکار جانتے تھے کہ اُن کا حقہ پانی بند کر دیا گیا تھا۔ گناہوں کے اقرار میں داخل ہونے کا مطلب دوزخ کا انتخاب کرنا تھا۔ اور چرچ ان میں اپنے بدترین دشمنوں کا ادراک کرتا ہے۔ صرف چند ادیب ہی یہ احتجاج کر سکے، کہ کس بات کی وجہ سے ایک دانشور نے مذہبی رسومات ادا کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ یہ صحیح بات تھی خاص کر جو شخص اسٹیج پر فوت ہوا اور اداکار کی زندگی کو ابدی بنانے کے عمل کے درمیان ختم ہوا۔ اس معاملے میں جینیس کو شامل کیا جاتا ہے جو ہر شے سے ماورا ہوتا ہے۔ جینیس کسی شے کا بھی بہانہ تلاش نہیں کرتا کیونکہ وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ اُس کے لئے کیا سزا تجویز کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی مبہم دھمکی کا حتمی سزا کے ساتھ موازنہ کیا گیا تھا کہ بذاتِ خود زندگی بھی اس کے لئے کیا بچا کر رکھ رہی تھی۔ یہی وہ بات ہے جس کو وہ پہلے سے ہی محسوس کر رہا تھا اور کلی طور پر اس کو قبول کرتا تھا۔ اداکار کے لئے لغویت وقت سے پہلے ہی موت اس کے گناہوں کی تلافی ہے۔ کوئی شے بھی چہروں کا میزان نہیں بھر سکتی اس کے لئے صدیوں پر محیط وقت کو لوٹنا پڑے گا۔ بہر حال ایک انسان کو ہر حال میں مرنا ہے۔ اداکار ہر جگہ شک سے بالاتر ہے، تاہم وقت اُسے ساتھ ساتھ سُبک رفتاری سے گھسیٹتا ہے اور اس پر اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔

اداکار کی تقدیر کو محسوس کرنے کے لئے تھوڑے سے تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقت کے اندر ہی وہ اپنے کردار کو بناتا اور اس کو شمار کرتا ہے۔ اسی طرح وقت کے اندر ہی وہ ان پر غالب آنا سیکھتا ہے۔ جتنی شاندار زندگی میں وہ زندہ رہا ہوتا ہی وہ اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ وقت ابھی آتا ہے جب اُسے دُنیا کے لئے اسٹیج پر مرنا ہوتا ہے۔ جب وہ اسٹیج پر زندہ ہوتا ہے تو دُنیا کا سامنا کرتا ہے اور دُنیا کو سمجھنے کی اداکاری کرتا ہے۔ وہ اس مُہم جوئی کے

معیار کے ناقابلِ بدل اور دل خراش عمل کو دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے اور اب مرجاتا ہے۔ عمر رسیدہ اداکاروں کے لئے گھر تعمیر کر دیے گئے ہیں۔

فتح

فاتح نے کہا تھا کہ یہ فرض نہ کرو کہ مجھے ایکشن سے محبت ہے اس لئے غور و فکر کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ اس کے برعکس میں وہی عمل کرتا ہوں جس پر میں یقین رکھتا ہوں۔ میں اس پر سختی سے یقین رکھتا ہوں اور میں اس کو واضح اور یقینی طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ اُن لوگوں سے خبردار رہو جو کہتے ہیں، 'میں اس کو اتنے اچھے طریقے سے جانتا ہوں کہ اس کا اظہار کر سکتا ہوں۔' اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو صرف اس لئے کہ وہ اس کو اچھے طریقے سے جانتے نہیں صرف اپنی سُستی اور کاہلی کی وجہ سے بیرونی پرت تک ہی محدود ہوتے ہیں۔

زندگی کے آخر میں ایک انسان جائزہ لیتا ہے کہ اُس نے صرف ایک سچائی کے لئے کئی سال گزار دیے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ واحد سچائی زندگی کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو یقیناً ایک فرد کے بارے میں کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ ایک شخص کو دو ٹوک بات کرنی چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو حقارت کے ساتھ بات کر سکتا ہے۔

'انسان جو کہتا ہے اس کی نسبت زیادہ تر وہ ہوتا ہے جو نہیں کہتا بلکہ راز رہتا ہے۔' بہت سے راز ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ لیکن میرا پختہ یقین ہے کہ وہ تمام لوگ جنھوں نے ایک فرد کو جج کیا ہے انھوں نے بہت ہی کم تجربہ کیا ہے جس پر ہم اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ذہانت،، معرکتہ الارا ذہانت نے پہلے سے ہی پیشین گوئی کی تھی کہ اسے کیا نوٹ کرنا چاہیے۔ لیکن اس عہد کے خون خرابے نے حقائق کے ساتھ ہم پر غلبہ پا لیا ہے۔ حالیہ مشینی عہد کی قوموں کے لئے سوسائٹی اور فرد کی اچھائی کا ایک دوسرے کے مقابلے میں وزن کریں، یہ تلاش کرنے کی کوشش کریں کہ کس کو دوسرے کی خدمت کے لئے مجبور کیا جائے۔ اس کو شروع کرتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ نیکی کے ذریعے انسان

کے ذہن کا وہ سرکش انحراف جس کے ذریعے بنی نوع انسانوں کو خدمت کرنے یا خدمت کروانے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا، دوسری جگہ پر ممکن تھا کیونکہ نہ تو سوسائٹی اور نہ ہی ایک فرد نے ابھی تک اپنی تمام قابلیت کو عیاں کیا تھا۔

میں نے نامی گرامی ذہنوں اور جنگوں کے عروج پر ڈچ فنکاروں کے شاہکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دیکھا۔ جس میں تیس سالہ خوفناک جنگوں کے دوران خانقاہوں میں صوفیوں اور ولیوں کو عبادت کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے خدائی اقدار سیکولر شورش میں بھی قائم تھیں۔ آج کے فنکار اس قسم کی سنجیدگی سے محروم ہیں۔ خواہ اُن کے پاس تخلیق کار کی ضرورت کے لئے دل ہو، میرا مطلب ہے وہ بند دل جو ہر کسی کے استعمال کا نہیں ہوتا جس میں ہر شخص بشمول سینٹ کو بھی متحرک کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کو دل کی گہرائی سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہر خاکے اور استعارے میں عبادت کو فولاد کے تحت کچل دیا جاتا ہے۔ یہ آگہی کہ میں اپنے وقت سے جدا نہیں ہو سکتا میں فیصلہ کرتا ہوں کہ میں اس کا حصہ بنوں گا۔ اسی لیے میں ایک فرد کی تکریم کرتا ہوں کیونکہ اس نے مجھے ذلّت اور مضحکہ خیز ہونے کے طور پر متاثر کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ فتح یاب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، میں کھوئے ہوئے مقاصد کو پسند کرتا ہوں، ان کے لئے گناہوں سے پاک صاف روح چاہیے جو اس کی شکست کے مساوی ہو جو اس کی عارضی فتوحات کے لئے وقف ہو۔ کوئی بھی شخص جو اس دُنیاوی قسمت کے ساتھ وابستہ ہے تہذیبوں کا تصادم اس کے لئے کرب کا باعث بنتا ہے۔ میں اسی وقت ہی اس کرب کو اپنا بناتا ہوں جب اس میں شامل ہوتا ہوں۔ تاریخ اور دوام کے درمیان تاریخ کا انتخاب کرتا ہوں کیونکہ میں یقین دہانیوں کو پسند کرتا ہوں۔ کم از کم مجھے یقین ہے اور میں اس قوت سے کیسے انکار کر سکتا ہوں جو مجھے کچل رہی ہے؟

زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب ایک شخص کو فکر اور عمل کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اسی کو انسان بننا کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے جھٹکے دہشت ناک ہوتے ہیں۔ ایک

کمزور دل سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ خدا یا وقت، صلیب یا تلوار کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اس دُنیا کے اعلیٰ وارفع معنی ہیں جو اس کی پریشانیوں سے ماوراء لے جاتے ہیں یا ان پریشانیوں کے علاوہ کچھ بھی سچ نہیں ہے۔ ایک شخص کو وقت کے ساتھ رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ مرنا چاہیے یا زندگی کے اعلیٰ معنی کے لئے گریز کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک شخص سمجھوتہ کر سکتا ہے اور خُدا پر یقین رکھتے ہوئے بھی اس دُنیا میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کو ایمان لانا کہتے ہیں۔ میں اس اصطلاح کے ساتھ عہد کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ سب کچھ یا کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اگر مجھے ایکشن درکار ہے تو یہ مت سوچیں کہ فکر میرے لئے نامعلوم شے ہے۔ فکر مجھے سب کچھ نہیں دے سکتی مگر خُدا اسے محروم کر سکتی ہے، میں اپنے آپ کو وقت کا اتحادی بنا لیتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہ تو واپس لوٹ جانے کے عارضے یا تلخیوں کو خاطر میں لاتے ہوئے مغلوب کرتا ہوں اور میں صرف واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کل آپ متحرک ہوں گے۔ میرے اور آپ کے لئے یہی آزادی ہے۔ ایک فرد کچھ نہیں کر سکتا پھر بھی وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس حیران کن غیر متعلق حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں ایک ہی وقت میں کیوں اس کو بلند کرتا اور کچل دیتا ہوں۔ یہ وہ دُنیا ہے جو اسے سفوف بنا دیتی ہے اور میں اسے آزاد کراتا ہوں۔ میں اسے تمام حقوق فراہم کرتا ہوں۔

فاتح جانتے ہیں کہ بذاتِ خود ایکشن بھی بے کار ہوتا ہے۔ تاہم ایک کارآمد ایکشن ہے یعنی انسان اور زمین کو دوبارہ بنانا۔ میں انسانوں کو کبھی دوبارہ نہیں بناؤں گا۔ لیکن ایک انسان کو "گویا" بنانا چاہیے۔ جدوجہد کا راستہ مجھے خونریزی کی طرف لے جاتا ہے۔ خواہ اس کی تذلیل کی جائے خونریزی ہی میرا یقین ہے۔ میں صرف اسی پر رہ سکتا ہوں۔ تخلیق میرا آبائی خطہ ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس بے سروپائی اور غیر مؤثر کوشش کا انتخاب کیا ہے۔ اسی وجہ سے میں جدوجہد کا طرفدار ہوں۔ دورِ حاضر میں میں اپنے آپ کو اسی طرف لے جاتا ہوں جیسا میں نے کہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ایک فاتح کی عظمت جغرافیائی تھی۔

جس کی عظمت کی پیمائش فتح کیے جانے والے علاقوں سے کی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تھی کہ ایک لفظ کے معنی کیوں تبدیل ہو گئے اور فاتح جنرل کی عظمت کو ترک کر دیا گیا۔ عظمت نے اپنے معنی تبدیل کر دیے۔ یہ احتجاج اور قربانی کی اندھی حمایت میں مُضمر ہو گئی۔ یہاں پر بھی یہ شکست کی ترجیحات کی بجائے فتح کی ہی آرزو تھی۔ تاہم ایک ہی فتح کی آرزو تھی اور وہ ابدی تھی۔ یہ فتح مجھے کبھی نہیں ہو گی۔ اسی سے ہی میں نے غلطی کھائی اور چمٹ گیا۔ پرومیتھوس انقلاب کا داعی تھا اس نے سکھایا کہ انقلاب کی ہمیشہ دیوتاؤں کے خلاف جدوجہد میں ہی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ انسان کا اپنی ہی قسمت کے خلاف فیصلہ تھا جب کہ غریب کے حق میں جدوجہد صرف ایک بہانہ تھا۔ میں اس جذبے کی روح کو تاریخی عمل کے ذریعے اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں اور یہاں پر ہی میرا اس کے ساتھ آمنا سامنا ہوتا ہے۔ یہ فرض مت کریں کہ میں اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں یعنی ضروری تضادات کے برعکس میں اپنے انسانی تضاد کو برقرار رکھتا ہوں۔ جس کی میں نفی کرتا ہوں اس کے درمیان میں تابندگی کو قائم کرتا ہوں۔ میں اُس کے سامنے انسان کی وقعت بڑھاتا ہوں جو میری آزادی اور مجھے کچل دیتی ہے۔ میری بغاوت اور میرا جنوں اس تناؤ میں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں وہ تابندگی اور تکرار ہے۔

ہاں انسان ہی اس کا مقصد ہے۔ وہی صرف اس کا اپنا مقصد ہے۔ اگر یہ کسی شے کا مقصد ہے تو یہ اس کی زندگی ہوتی ہے۔ اب میں اس کو اچھے طریقے سے جان گیا ہوں۔ بعض اوقات فاتحین فتح یاب ہونے اور غالب ہونے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کسی ایک شخص پر فتح یاب ہونا ہوتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مخصوص لمحات میں ہر انسان اپنے آپ کو خدا کے مساوی خیال کرتا ہے۔ کم از کم یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم خونریزی حقیقت ہے جہاں پر اُس نے انسانی ذہن کی عظمت کو محسوس کیا ہے۔ فاتحین انسانوں کے درمیان وہ انسان ہیں جو اپنی طاقت کے بارے میں آگاہ ہیں اور مسلسل بلندیوں پر رہنے کے یقین سے بھرے ہوئے

اپنی عظمت سے آگاہ ہیں۔ یہ کم وبیش حساب کا سوال ہے۔ فاتحین اس سے بھی زیادہ کے اہل ہیں۔ تاہم وہ اس سے زیادہ کے اہل نہیں ہوتے جو ایک انسان چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بنی نوع انسان کو آزمائش میں نہیں چھوڑتے تاکہ وہ انقلاب کی کھولتی ہوئی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جائیں۔

وہ مخلوق کو ناقص پاتے ہیں۔ وہ یہاں پر صرف ایسی قدروں کو پاتے ہیں جن کو وہ پسند کرتے ہیں اوران کی قدر کرتے ہیں یعنی انسان اوراس کی خاموشی کو پسند کرتے ہیں۔ یہی اُن کی محتاجی اور دولت ہے۔ اُن کے لئے صرف ایک ہی آسائش ہے یعنی انسانی تعلقات کی۔ ایک شخص یہ جاننے میں کیسے ناکام ہوجاتا ہے کہ اس غیر محفوظ کائنات میں ہر شے فانی ہے اور صرف انسان ہی اس کے زیادہ زندہ معنی فرض کرتے ہیں۔ تنے ہوئے چہرے، خطرے میں انسانوں کے درمیان بھائی چارہ، اس قسم کی مضبوط اور پاکباز دوستی۔ یہی وہ سچی دولت ہے کیونکہ باقی سب تغیر میں ہے۔ اس کے وسط میں انسان اپنی قوتوں اور حدود سے زیادہ باخبر ہے۔ یہی اس کی تاثیر ہے۔ کچھ لوگوں نے جینیس کی بات کی ہے۔ تاہم جینیس کی بات کرنا آسان ہے لیکن میں ذہانت کو ترجیح دیتا ہوں۔ جس کو جلا بخشنی چاہیے۔ ذہانت اس صحرا کو روشن کرتی ہے اور اس پر غالب آجاتی ہے۔ یہ اس کے فرائض کو جانتی ہے اور ان کی مثال دیتی ہے۔ یہ جسم کے ساتھ ہی مرجاتی ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے اس کی آزادی کی تشکیل کرتی ہے۔

ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ تمام چرچ ہمارے خلاف ہیں۔ ایک دل جو اشتیاق کو بڑھا دیتا ہے دوام سے بچ نکلتا ہے اور تمام چرچ، خُدائی یا سیاسی دوام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خوشی اور جرأت، انتقام یا انصاف ثانوی مقاصد ہیں۔ وہ اسی اُصول کو سامنے لاتے ہیں جن پر ایک شخص کو دستخط کرنے چاہئیں۔ میرا دوام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ سچائیاں جو میرے احاطے میں آتی ہیں ان کو ہاتھ سے چھوا جا سکتا ہے۔ میں ان سے جُدا

نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے آپ کسی شے کو میرے اوپر بنیاد نہیں بنا سکتے یعنی فاتح کی کوئی شے بھی دیرپا نہیں ہوتی حتیٰ کہ اس کے عقائد بھی دیرپا نہیں ہوتے۔

سب آخر میں موت کا سامنا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موت ہر شے کا اختتام ہے۔ اسی لئے انسان پورے یورپ کے قبرستانوں میں چھپے ہوئے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ لوگ صرف اسی شے کو خوبصورت بناتے ہیں جس سے محبت کرتے ہیں۔ موت ہمیں پسپا کر دیتی ہے اور ہمارے صبر کو تھکا دیتی ہے۔ اس کو فتح کرنے کی ضرورت ہے۔ پدوا میں آخری قیدی اپنے سنسان محل میں چیختے اور بھاگتے ہوئے موت کی دعائیں مانگ رہا تھا جس کو طاعون نے خالی کر دیا تھا۔ جس کا باہر سے وینٹکوں نے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس پر قابو پانے کا یہی طریقہ تھا اور یہ جرأت کا نشان تھا جو پچھم کی جرأت کی خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے جس نے ان جگہوں کو اتنا بھدا بنا دیا تھا کہ وہاں موت کو بھی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ باغی کی کائنات میں موت انصاف سے عظمت پاتی ہے۔

پدوا کے اس قیدی کے علاوہ باقی لوگوں نے سمجھوتہ کیے بغیر دوام کا انتخاب کیا تھا اور دُنیا کے سراب سے منحرف ہو گئے تھے۔ اُن کے قبرستان بے شمار پھولوں اور پرندوں کے درمیان مُسکراتے ہیں۔ یہ فاتحین کے لئے مناسب ہے جو اسے واضح شکل دیتے ہیں جنہوں نے اسے رد کر دیا تھا اس کے برعکس کمہار کے پیشے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ خدا کے بندوں کے درمیان سب سے بہترین لوگ کبھی کبھار گھبراہٹ کی گرفت میں آ جاتے ہیں جو ذہنوں کے غور و فکر اور رحم کیساتھ گڈمڈ ہوتی ہے جو اپنی موت کی شبیہہ کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں۔ تاہم وہ ذہن اپنی قوت اور جواز اسی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری قسمت ہمارے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور ہم اسے مشتعل کرتے ہیں۔ بعض اوقات ہم بھی اپنے آپ پر ترس کھاتے ہیں۔ یہی واحد ترس ہے جو ہمیں قابلِ قبول نظر آتا ہے یعنی ایک ایسا احساس جس کو آپ شاید ہی سمجھ سکیں، جو آپ کو شاذ ہی مردانہ نظر آتا ہو۔ ہم میں سے سب سے

زیادہ جرأت مند وہ شخص ہے جو اس کو محسوس کرتا ہے۔ ہم روشن خیالی کو ہی مردانہ سمجھتے ہیں اور ہم ایسی قوت نہیں چاہتے جو تابناکی سے جدا ہے۔

مجھے دہرانے دیں کہ یہ صورتیں اخلاقی ضابطہ حیات تجویز نہیں کرتیں اور قیاس کو شامل نہیں کرتیں یعنی صرف خاکے ہوتے ہیں۔ یہ صرف زندگی کے انداز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عاشق، اداکار یا مہم جو بے سروپائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر وہ متقی انسان بیوروکریٹ یا جمہوریہ کا صدر بننا چاہتا ہے۔ اس کے لئے جاننا کافی ہے جو کسی شے پر بھی نقاب نہیں ڈالتا۔ اٹلی کے عجائب گھروں میں کبھی کبھار رنگ کی گئی سکرین پائی جاسکتی ہے جہاں پادری گنہگار انسان کے سامنے کھڑا ہوا کرتا تھا تاکہ اسے پھانسی سے پہلے نجات دلا سکے۔ تمام صورتوں میں جست دوام اور ابدیت کی طرف دوڑتے ہوئے خیال یا روزمرہ کے سرابوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ بے سروپائی کو چلمن کے پیچھے چھپاتی ہے۔ چلمن کے بغیر بھی سول سرونٹ ہوتے ہیں اور میں انہی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے انتہا پسندانہ بات کا انتخاب کیا ہے۔ اس سطح پر بے سروپا انسان ان کو شاہی اختیارات دیتا ہے۔ سچ ہے وہ شہزادے سلطنتوں کے بغیر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو دوسروں پر بھی فائدہ ہوتا ہے یعنی وہ جانتے ہیں کہ تمام رعایتیں فریب زدہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی اُن کی اشرافیہ ہے، اور اُن کے ساتھ چھپی ہوئی بدشگونیوں کا ذکر کرنا بے کار ہے۔ اُمید سے محروم ہونا مایوس ہونا نہیں ہے۔ زمینی شعلے یقیناً فلکی خوشبوؤں کے قابل ہیں۔ نہ ہی میں اور نہ ہی دوسرا کوئی اس کا قیاس کرسکتا ہے۔ وہ بہتر ہونے کی سعی نہیں کررہے ہیں وہ یک جا ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگر 'عقل مند' ہونے کی اصطلاح کا استعمال اس شخص پر کردیا جائے جو صرف اسی پر رہا ہے جو وہ ہے بغیر قیاس کیے کہ وہ کیا نہیں ہے تو وہ عقل مند انسان ہے۔ ذہن کے دھارے میں ایک انسان فاتح ہے، علم کے لحاظ سے ڈان جون، ذہانت کے لحاظ سے ایکٹر بہتر جانتا ہے۔ آپ ارض و سماء پر استحقاق کے حق دار ہو جو اپنی چھوٹی اور

پیاری مسکین سی بھیڑ کو مقصد کی تکمیل کے لئے قربان کرتے ہوتا ہم آپ اس مضحکہ خیز چھوٹی سینگوں والی مسکین بھیڑ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو۔ حتیٰ کہ یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ نخوت سے نہ پھٹ پڑو اور بطور جج بہانہ کرتے ہوئے سکینڈل تخلیق نہ کرو۔

اس حالت میں ضروری تھا کہ بے سروپائی منطق کو زیادہ قلبی مثالوں کے ذریعے بحال کرتی ہے۔ تخیل دوسروں کا بھی اضافہ کر سکتا ہے، وقت اور ملک بدری دکھوں اور مصیبتوں کے ساتھ زندہ رہنا سکھاتے ہیں۔ ایک ایسی کائنات میں جو مستقبل اور کمزوری کے بغیر ہے۔ یہ سب بے سروپائی اور خدا کے بغیر دُنیا ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے جو واضح طور پر سوچتے ہیں اور اُمید کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور میں نے سب سے زیادہ بے سروپائی کردار کی بات نہیں کی ہے کہ تخلیق کار کون ہے۔

لغویتی تخلیق

فلسفہ اور فکشن

جو لوگ لغویت کی پریشان کُن فضا میں زندہ رہتے ہیں وہ گہری اور ثابت قدم فکر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے جو ان کے اندر اپنی قوت کا نفوذ کر سکے۔ اس مقام پر وفاداری کا عجیب احساس پیدا ہوتا ہے۔ صاحبِ شعور لوگوں کو احمقانہ اور خونریز جنگوں کے درمیان اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے پایا گیا جس پر انھوں نے غور تک نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عدم سے آنکھ بچائی جا سکے۔ دُنیا کی لغویت کو برداشت کرنے میں مابعد طبیعاتی قسم کا وقار اور عزت پائی جاتی ہے۔ فتح یا کردار سازی، گوناں گوں محبت، بے سروپا بغاوت ایک انسان کو خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں کیونکہ اس میں ایک انسان کو وقت سے پہلے ہی شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

صرف جنگ کے اصول سے وفادار رہنے کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فکر ذہن کو اس پر قائم رکھنے کے لئے کافی دلائل فراہم کرے یعنی یہی دلیل پوری تہذیب کی حمایت کرتی ہے۔ جنگ کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ایک شخص کو اس میں زندہ رہنا چاہیے یا اس میں مرنا چاہیے۔ اسی بات کا اطلاق لغویت پر ہوتا ہے یعنی اس کے ساتھ زندہ رہنا ہے اور اس کے اسباق کو تسلیم کرنا ہے اور جسمانی خواہشات کو دریافت کرنا ہے۔ اسی لیے لغویت کی بدرجۂ اتم خوشی تخلیق میں ہے۔ نٹشے نے کہا تھا 'آرٹ اور عدم کے علاوہ صرف آرٹ ہے۔' سچائی کے لئے قربانی نہ دینے کی خاطر ہمارے پاس آرٹ ہے۔

میں جس تجربے کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور جن طریقوں پر زور دینے کی کوشش کر رہا ہوں اس کے مطابق سچ ہے جہاں بھی ایک اذیت مرتی ہے وہاں نئی اذیت سر نکال لیتی ہے۔فراموش کیے بغیر طفلانہ تعاقب اور اطمینان کی اپیل اب گونج سے خالی ہے۔ وہ مسلسل تناؤ جو انسان کو دُنیا کا آمنا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور مخصوص قسم کی ذہنی تکلیف جو انسان کو ہر شے قبول کرنے کے لئے اُکساتی ہے اسے بخار میں مبتلا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔اس کائنات میں آرٹ کا کام اس شعور کو برقرار رکھنے اور اس کی مہم جوئی کو فکس کرنے کا واحد موقع ہے۔تخلیق کرنا دوہری زندگی بسر کرنا ہے۔ٹٹولنا، بے تاب جُستجو کرنا، احتیاط سے پھول جمع کرنا، دیواروں پر وال پیپر لگانا اور پریشانیوں کا کھوج لگانا کسی شے کو بھی نمایاں نہیں کرتا۔اس میں مسلسل اور ناقابلِ ادراک تخلیق کے علاوہ کوئی قابل ذکر شے نہیں ہے جس میں اداکار، فاتح اور بے سروپا انسان اپنی روزمرہ زندگی کے جی بھر کر مزے لیتے ہیں۔تمام بھانڈوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے حقیقت کی نقل اور تخلیقِ نو کی جاتی ہے۔ہم اپنی ہی سچائیوں کے ظاہر ہونے پر ختم ہو جاتے ہیں۔انسان کی پوری زندگی خُدا سے دور بے سروپائی کے نقاب تلے نقل اُتارنے کے برابر ہے۔تخلیق بذات خود نقل ہے۔

ایسے لوگ جانتے ہیں کہ آغاز کیسے کرتے ہیں اس کے بعد ان کی تمام توانائیاں اس کا معائنہ کرنے میں صرف ہوتی ہیں، اس کو وسعت دینے میں صرف ہوتی ہیں اور زندگی عطا کرنے والے اس جزیرے کو مالا مال کرنے میں صرف ہوتی ہیں جس پر اس نے ابھی لنگر انداز ہونا تھا۔تاہم سب سے پہلے ان کو جاننا چاہیے۔کیونکہ لغویتی دریافت ایسے وقفے سے ہم آہنگ ہے جس میں مستقبل کا جنوں تیار کیا جاتا اور اس کا جواز فراہم کیا جاتا ہے۔حتیٰ کہ دہریوں کے لیے بھی مقدس چراغ جلائے جاتے ہیں۔ایک انسان کو ان کے لئے سونا نہیں چاہیے بلکہ بیدار رہنا چاہیے۔بے سروپا انسان کے لئے اس کے حل اور وضاحت کا سوال نہیں بلکہ تجربہ اور وضاحت کا سوال ہے۔ہر شے ایسی لاتعلقی سے شروع ہوتی ہے جو بالکل واضح ہوتی ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ یہی لغویتی فکر کی آخری خواہش ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔ سائنس اس پیراڈاکس کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں پر رک کر غوروفکر کرتی ہے اور اس مظہر کے بے داغ لینڈ سکیپ کا خاکہ کھینچتی ہے۔ دل سکیتا ہے کہ جذبات ہمیں خوش کرتے ہیں خاص طور پر جب دُنیا کے پہلو گہرائی کی بجائے تنوع میں نظر آتے ہیں۔ جہاں پر وضاحت بے کار نظر آتی ہے کیونکہ حسّیات باقی رہتی ہیں اس طرح کائنات کے ساتھ مسلسل لگاؤ اپنی مقدار میں ناقابل فنا ہے۔ اسی نقطے پر ہی آرٹ کے فن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

آرٹ تجربات کی موت اور اس کی ضرب پر نشان لگاتا ہے۔ یہ ایک ہی اسلوب میں موضوعات کی پُر جوش تکرار پیش کرتا ہے جس کے سُروں کو پہلے ہی دُنیا نے ترتیب دیا ہوتا ہے یعنی جسم، مندروں پر بنی ہوئی سنتوری دار عمارتوں کی شکل، مختلف رنگ اور دُکھ سُکھ کے موضوعات کو بار بار اسٹیج پر سجایا جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لاتعلقی نہیں جس کے ساتھ اس مضمون کے تخلیق کار کی بیگانہ اور حیران کُن دُنیا کے اہم موضوعات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس میں کسی بھی علامت کو دیکھنا غلط ہوتا اور سوچنا کہ آرٹ کا فن بے سروپا انسان کی آخری پناہ گاہ ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک بے سروپائی معمہ ہے اور ہمارا تعلق صرف اس کی وضاحت اور تشریح سے ہے۔ لغویت ایک انسان کو اس دانشورانہ روگ سے فرار نہیں کراتی بلکہ اس روگ کی ایک علامت ہے جو ایک انسان کی پوری فکر میں جھلکتا ہے۔ تاہم پہلی دفعہ یہ ذہن کو اپنے آپ سے باہر نکلنے کے لئے مجبور کرتا ہے اور اس کو دوسروں کے بالمقابل کھڑا کرتا ہے۔ یہ ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ یہ گم ہو جائے بلکہ اس لئے ایسا کرتا ہے کہ اندھیرا راستہ دکھائے جس میں سب داخل ہوئے ہیں۔ بے سروپائی استدلال کے وقت، تخلیق لاتعلقی اور دریافت کی پیروی کرتی ہے۔ یہ اس نقطے کی نشاندہی کرتی ہے جہاں سے بے سروپائی جنوں پھوٹتا ہے اور استدلال رُک جاتا ہے۔ اس مضمون میں ان کا جواز اسی طریقے سے ڈھونڈا گیا ہے۔

مفکر اور تخلیق کار کے لئے چند مشترکہ موضوعات کو روشنی میں لانا کافی ہوگا تاکہ آرٹ

میں تمام فکری تضادات پائے جاسکیں جو لغویت میں شامل ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک جیسے نتائج نہیں جو ذہن کو تضادات معلوم ہوتے ہیں اور تمام لوگوں کے لیے مشترکہ ہوتے ہیں۔ایسا فکر اور تخلیق کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے مشکل سے ہی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یہی بے قراری انسان کو ان دو ر ڈیوں کو اپنانے کے لئے اُکساتی ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں پر آغاز میں یہ ایک مقام پر آجاتے ہیں۔ جو فکر بے سروپائی سے شروع ہوتی ہے بہت کم ہی اپنے اندر رہتی ہے۔ وہ تمام افکار جو بے سروپائی سے شروع ہوتے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ بہت کم اس کے اندر رہتے ہیں۔ان کے انحراف اور ایمان سے محرومی کے باعث میں یہ پیمائش کرنے کے قابل ہوا تھا کہ بے سروپا انسان کی ملکیت کیا ہے؟ اسی طرح میں حیران ہوں کہ کیا بے سروپائی کا فن ممکن ہے؟

آرٹ اور فلسفے کے درمیان سابقہ مخالفت کے درمیان مصالحتی نوعیت پر حد سے زیادہ اصرار کرتے رہنا ناممکن ہوگا۔ اگر آپ اس کو محدود معنوں میں لینے پر اصرار کرتے ہیں تو یقیناً یہ غلط ہے۔ اگر آپ کا صرف یہ مطلب ہے کہ دونوں مضامین میں سے ہر ایک کا اپنا ماحول ہے تو شاید یہ ممکن تو ہو لیکن یہ مُبہم رہتا ہے۔صرف واحد قابلِ قبول دلیل اس تضاد میں مضمر ہے جو فلاسفر اپنے نظام کے اندر اور فنکار اپنے فن کے ذریعے پروان چڑھاتا ہے۔یہ خاص قسم کے آرٹ اور فلسفے کے لئے موزوں ہے جس کو ہم ثانوی سمجھتے ہیں۔ایک فلاسفر کا خیال اپنے تخلیق کار سے الگ تھلگ نہ صرف غیر مروّج ہے بلکہ غلط بھی ہے۔فلاسفر کی مخالفت میں دلیل دی جاتی ہے کہ ایک فلاسفر بہت سے نظام تخلیق نہیں کر سکتا۔اسی طرح آرٹسٹ بھی ایک سے زیادہ چیزوں کو مختلف پہلوؤں سے بیان نہیں کر سکتا۔آرٹ میں تجدید کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔پہلے سے ادراک شدہ اصول کے ذریعے ہی اسے سچ ثابت کیا جاسکتا ہے۔آرٹ کا کام تعمیراتی کام کی طرح ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ عظیم تخلیق کار کتنا یکسانیت کا شکار ہوتا ہے۔مفکر کی طرح فنکار بھی اپنے آپ کو وقف کرتا ہے اور اپنے کام

کے ذریعے ہی بنتا ہے۔ وہ نفوذ جمالیاتی مسئلے کے سب سے اہم مسئلے کو اُٹھاتا ہے۔ جو شخص بھی ذہن کی برتری کا قائل ہوتا ہے اس کے نزدیک مادی اشیاء کو اہمیت دینا بے کار ہے۔ ان موضوعات کے درمیان کوئی حد نہیں جو انسان محبت کرنے اور محبت کو سمجھنے کے درمیان قائم کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں اور وہی اضطراب ان کو آپس میں زائل کر دیتا ہے۔

آرٹ کے لغویتی کام کو ممکن بنانے کے لیے آرٹ میں فکر کا اظہار ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فکر کو ذہانت کے علاوہ نمایاں نہیں ہونا چاہیے۔ اس پیراڈاکس کی بے سروپائی کے مطابق وضاحت کی جا سکتی ہے۔ آرٹ کا فن انکار سے جنم لیتا ہے۔ یہ شہوانیت کے غلبے کی علامت ہے۔ یہ تابناک فکر ہے جو اسے اُبھارتی ہے لیکن اس بنیادی عمل میں یہ خیال اپنے آپ سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ یہ اس حرص کے سامنے نہیں پھیلتا جس کو گہرے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے جس کو یہ جانتا ہے کہ ناجائز ہے۔ آرٹ کا کام ذہانت کے ڈرامے کی تجسیم کرتا ہے لیکن یہ اس کو بلواسطہ طریقے سے ثابت کرتا ہے۔ بے سروپا کام تقاضا کرتا ہے کہ ایک فنکار شعوری طور پر ان حدود سے باخبر ہو جو ٹھوس ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا، معنی اور زندگی کو تسلی بخش انداز میں تخلیق کرنا یا نہ تخلیق کرنا کسی شے کو تبدیل کرنا نہیں ہوتا۔ بے سروپا فنکار اپنے کام کو انعام کے لئے تیار نہیں کرتا بلکہ وہ انعام کی تردید کرتا ہے۔

آرٹ کا سچا کام انسان ہی کر سکتے ہیں یہی وہ کام ہے جو کم بولتا ہے۔ یقیناً فنکاروں کے عالمی تجربات ان کے شاہکار کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تعلق اس وقت بے ڈھنگا ہو جاتا ہے جب یہ کام وضاحتی ادب کو لیس کے کاغذ میں کلی تجربہ بیان کرنے کے لئے وقف کرتا ہے۔ یہ شاہکار اس وقت اچھا ہوتا ہے جب یہ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے، جو ہیرے کا ایک رُخ ہے جس کی اندرونی چمک ہی اس کی خصوصیات کا خلاصہ کرتی ہے۔ پہلی حالت میں ابدیت پر بوجھ زیادہ ہے اور یہ غیر سنجیدہ حالت ہے۔ دوسری حالت میں کام زرخیز ہے

کیونکہ اس میں پورا تجربہ ہی لاگو کیا گیا ہے جس کی دولت مشکور ہے۔ بے سروپا آرٹسٹ کا مسئلہ اس شرافت کو حاصل کرنا ہے جو شرافت سے ماورا ہے۔ اس ماحول میں عظیم آرٹسٹ ہی عظیم انسان ہے۔ اس حالت میں زندہ رہنا ایسا ہی تجربہ ہے جیسا اس پر غور وفکر ہے۔ اس کا فن دانشورانہ ڈرامے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بے سروپا انسان اپنی ہی شہرت سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کی دست برداری مزید ذہانت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی جو رفتہ رفتہ نمودار ہوتی ہے جس کو آرٹ کے ذریعے ڈھانپا جاتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر دُنیا ہوشیار ہوتی تو آرٹ تخلیق نہ ہوتا۔

میں رنگوں اور شکلوں کے فن کی بات نہیں کرتا جس میں صرف وضاحت ہی انکساری پر فتح یاب ہوتی ہے۔ جہاں فکر ختم ہوتی ہے وہاں اسلوبِ بیاں شروع ہوتا ہے۔ وہ لڑکے جن کی آنکھوں کے سوتے خالی تھے جن کو لوگوں نے مندروں اور عجائب گھروں میں سجا دیا تھا۔ ان کا فلسفہ ان کے اشاروں سے واضح ہے۔ یہ نظارہ تمام لائبریریوں سے زیادہ تعلیم کا باعث ہے۔ دوسرے پہلو کے لئے یہی میوزک درست ہے۔ اگر آرٹ بھی اسباق سے خالی ہے تو یقیناً یہ موسیقی ہے۔ اس کا حساب سے بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ وہ کھیل جو ذہن اپنے ہی طے کردہ اصولوں اور قواعد کے مطابق کھیلتا ہے تو قواعد اس چکر کے اندر ہی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں یہی ہماری ملکیت ہے۔ اس سے آگے صرف ارتعاش ہی غیر انسانی کائنات میں پایا جاتا ہے۔ جسے خالص حسّیات ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ مثالیں بہت ہی آسان ہیں۔ بے سروپا انسان ان کی اپنی ہی ہم آہنگیوں اور شکلوں کے ذریعے پہچان کرواتا ہے

میں ایسے آرٹ کی بات کر رہا ہوں جس کی ترغیب کی وضاحت ہی عظیم رہتی ہے، جس میں سراب اپنے آپ کو خود بخود ہی پیش کرتا ہے جس میں ماحاصل ناگزیر ہوتا ہے۔ میرا مطلب افسانوی تخلیق ہے۔ میں جاننے کی تجویز دیتا ہوں کیا بے سروپائی اپنا پاؤں جما سکتی ہے یا نہیں۔

سوچنے کا مطلب دُنیا تخلیق کرنا ہے۔ اس کا آغاز انسان کی بنیادی رضامندی سے ہوتا ہے جو انسان کو اپنے ہی تجربے سے جُدا کرتی ہے تا کہ وہ ماضی کے عارضے کے مطابق مشترکہ بنیاد تلاش کر سکے۔ ایسی کائنات جو استدلال سے گھری یا مشابہتوں سے روشن ہوتی ہو جو ہر لحاظ سے ایسا موقع فراہم کرتی ہو جو جدائی کو منسوخ کرتا ہے۔ کوئی بھی فلاسفر خواہ کانٹ ہی کیوں نہ ہو تخلیق کار ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ہی کردار، علامات اور ایکشن ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ہی پلاٹ ہوتا ہے جس کا اختتام اپنے ہی انداز سے کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، ناول کی شاعری اور مضمون پر برتری فن کی عظیم دانشوریت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کے بارے میں ہماری کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ میں عظیم لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ ادبی شکل کی زرخیزی اور اہمیت کو اکثر اس مواد سے ماپا جاتا ہے جس پر یہ مشتمل ہوتی ہے۔ برے ناولوں کی تعداد ہمیں اچھے ناولوں سے غافل نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اپنے ساتھ اپنی ہی کائنات لاتے ہیں۔ ناول کی اپنی منطق ہوتی ہے، اس کا اپنا ہی استدلال ہوتا ہے، یہ اپنے ہی وجدان کا مالک ہوتا ہے اور اس کے اپنے ہی دعویٰ ہوتے ہیں، اس کے اپنے ہی فصاحت کے مطالبات ہوتے ہیں۔

وہ کلاسیکی متضاد پوزیشنیں جن کے بارے میں میں بات کر رہا ہوں اس معاملے میں کم جائز ہیں۔ آج جب فکر کائنات کے سامنے دعویٰ کرنا رُوک دیتی ہے، جب اس کی بہترین تاریخ اس کے پچھتاووں پر مشتمل ہوتی ہے تو ہم وہ نظام جان سکیں گے جو قابلِ وقعت ہوگا، اس کو اس کے مصنفوں سے جُدا نہیں کیا جا سکے گا۔ بذاتِ خود اخلاقیات بھی اس کے اپنے ہی پہلوؤں میں سے ایک ہے جو ایک لمبا اور مناسب حد تک اپنی ہی ذات کا اظہار ہے۔ تجرد خیال اپنے ہی گوشت کے مفروضے کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جسم کی افسانوی حرکات اور جذبات کسی حد تک انسان کے دُنیا کے بارے میں وژن کے مطابق باقاعدہ کی جاتی ہیں۔ مصنف ہمیں بہت سی کہانیاں بتاتا ہے اور اپنی کائنات تخلیق کرتا ہے۔ عظیم ناول فلسفیانہ ناول ہیں جو ان مقالات لکھنے والوں کے برعکس ہیں جن میں بالزاک، ساڈ، میل

ویلی، ستینڈل، دوستوفسکی، پروست، مالروکس، کافکا جیسے شامل ہیں۔

انہوں نے حقیقت کی بجائے اشاروں میں لکھا اور فرضی کردار تخلیق کیے جو وضاحتی اصول کی غیر افادیت کے قائل تھے اور قابلِ ادراک ظاہریت کے تعلیمی پیغام کے بارے میں یقینی تھے۔ وہ آرٹ کے کام کو ابتداء اور انتہا سمجھتے تھے۔ یہ اکثر غیر اظہار شدہ فلسفے کا نتیجہ ہے، اس کی مثال اور اس کی تکمیل ہے۔ یہ اسی فلسفے کی پیچیدگی کے ذریعے مکمل ہوتی ہے۔ کم از کم یہ اس کو جائز قرار دیتی ہے، کم از کم اس پرانے موضوع کی تفریق کو کہ کم از کم یہ چھوٹی سی فکر سے بیگانہ ہو جائے جہاں پر زیادہ تر فکر زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ حقیقت کو سنوارنے کے اہل نہ ہونے کے باعث فکر اپنے ہی مصنوعی پن میں گھر جاتی ہے۔ زیرِ بحث ناول اس لازوال اور اضافی علم کا آلہ ہے جسے محبت کہا جاتا ہے۔ محبت کے بارے میں افسانوی تخلیق میں ابتدائی طور پر حیرانی ضرور ہوتی ہے اور زرخیز غور و فکر کا سامنا کرتی ہے۔

کم از کم یہی وہ طلسم ہے جو آغاز سے ہی نظر آتا ہے۔ میں اس کو شرمسار فکر کے ایسے شہزادوں کے روپ میں دیکھتا ہوں جن کی خودکشی کی بعد میں گواہی دیتا ہوں۔ درحقیقت میری دلچسپی صرف اس میں ہے جو اس قوت کو بیان کرنے اور جاننے میں ہے جو ان کو دوبارہ سراب کے راستے پر لے جاتی ہے۔ نتیجتاً یہی راستہ ہی آگے لے جانے میں مدد دیتا ہے۔ اس کو پہلے ہی استعمال کرنے کی حقیقت دلائل کو مختصر کر دیتی ہے اور میں ان کو ہچکچاہٹ کے بغیر سمیٹ دیتا ہوں۔ کیا اپیل کے بغیر زندگی قبول کرنے سے ایک شخص کام پر متفق ہو جاتا ہے اور اپیل کے بغیر تخلیق کر لیتا ہے؟ ایسی آزادی کی طرف لے جانے والا راستہ کونسا ہے؟ میں اپنی کائنات اس کے بھوتوں اور گوشت پوست کے لوگوں سے آزاد کراتا ہوں جن کی موجودگی سے میں انکاری نہیں ہوں۔ میں تخلیقی رویے کا انتخاب کرتا ہوں۔ بے سروپائی رویے کو اگر ایسا رہنا ہے تو اپنی ناجوازیت میں رہنا چاہیے۔ یہی آرٹ کے ساتھ ہوا۔ تخلیق میں شرح کی ترغیب سب سے مضبوط ہوتی ہے۔ افسانوی دنیا میں حقیقی دنیا کی

آ گہی مستعد ہو جاتی ہے، کیا میں جج کرنے کی خواہش کو قربان کیے بغیر بے سروپائی کے ساتھ وفادار رہ سکتا ہوں؟ بہت سے سوالات کو غور و فکر کا سبب بنایا جا سکتا ہے۔ آ گہی کی یہ آخری ہچکچاہٹ ابتداء کو بھولنے کے لئے خوفزدہ ہوتی ہے اور سراب کے مشکل سوالات اُٹھاتی ہے۔ تخلیق کو گرفت میں لینے والا اپنے سامنے زندگی کے ہر قسم کے سٹائل کو گرفت میں لیتا ہے۔ فاتح یا اداکار، تخلیق کار یا ڈان جون یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا عمل پاگل پن کردار کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ ایک شخص بڑی تیزی سے اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ انسان خوش ہونے کے لئے رقم کماتا ہے اسی لئے اس کی پوری کوشش اور زندگی کا بہترین حصّہ یہی رقم کمانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خوشی بھول جاتا ہے اور دولت کمانے میں الجھ جاتا ہے۔ فاتح کی تمام کوشش کا رُخ ترغیب یا تحریص کی طرف موڑ دیا جاتا ہے جو عظیم زندگی کا راستہ ہے۔ ڈان جون اپنی قسمت قبول کر لیتا ہے، اور اپنی ہستی کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے جس کی شان و شوکت بغاوت میں مضمر ہوتی ہے۔ ایک آ گہی ہے اور دوسری بغاوت، دونوں حالتوں میں بے سروپائی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بضد اُمید انسانی دل میں ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ محروم انسان بھی سراب قبول کرنے پر زندگی ختم لیتا ہے۔ امن کی ضرورت کے لئے جوش پیدا کرنے والی آواز دل میں زندگی کو قبول کرنے کے برابر ہوتی ہے۔ انسان کے لئے درمیانی راستہ تلاش کرنا ضروری ہے۔

بے سروپائی کی ناکام ہنگامی حالت ہمیں باخبر کرتی ہے کہ یہ کیا ہے۔ اگر ہمیں بتا دیا جائے تو یہ بتانا کافی ہوگا کہ افسانوی تخلیق اسی ابہام کو یقینی فلاسفی میں پیش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک کام کا انتخاب کر سکتا ہوں جو ہر شے پر مشتمل ہوتا ہے اور بے سروپائی کی آ گہی کو بیان کرتا ہوں جس کا واضح نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ بے سروپائی کا اس کی ذات میں احترام نہ کیا جائے تو ہم جان سکتے ہیں کہ کون سا قرینِ مصلحت سراب اس میں داخل ہوتا ہے۔ ایک مثال، موضوع اور تخلیق کار کی دائمی وفاداری کافی ہوتی ہے۔ اسی تجزیے کو شامل کیا جاتا ہے جس کو پہلے ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

میں دوستوفسکی کے مقبول موضوع کو بیان کرتا ہوں۔ میں نے شاید بہت سے دوسرے کاموں کو بھی بیان کیا ہے۔ لیکن اس کام میں مسئلے کو براہ راست حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جذبات اور شرافت کے اسی مفہوم میں موجودیاتی فلسفے نے پہلے ہی اس پر بحث کی ہے۔ یہ متوازیت میرے مقصد کو پورا کرتی ہے۔

کریلو (Kirilov)

دوستوفسکی کے تمام ہیروز زندگی کے معنی تلاش کرنے کے لئے سوال اُٹھاتے ہیں۔ اس لئے وہ ماڈرن ہیں وہ بے سروپائی سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ جدید شرافت کو کلاسیکل شرافت سے جو بات ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کلاسیکل شرافت اخلاقی مسائل پر توجہ دیتی ہے اور جدید شرافت مابعد الطبیعاتی مسائل پر توجہ دیتی ہے۔ دوستوفسکی کے ناولوں میں اس سوال کو اتنی شدت کے ساتھ چھیڑا گیا ہے کہ اس میں صرف انتہا پسندانہ حل ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ زندگی یا تو سراب ہے یا خُدا ہے۔ اگر دوستوفسکی تجسّس سے مطمئن ہوتا تو وہ فلاسفر ہوتا۔ وہ نتائج کی ایسے شرح کرتا ہے جیسے وقت کی۔ دانشورانہ وقت گزاری انسانی زندگی کا حصّہ ہے اس طرح وہ آرٹسٹ ہے۔ ان نتائج کے درمیان اس کی توجہ کا مرکز آخری شے ہے، جس کو وہ اپنی ڈائری میں مصنف کی منطقی خودکشی کہتا ہے۔ 1876 کی قسط میں وہ "منطقی خودکشی" کے استدلال کا خیال کرتا ہے۔ وہ قائل ہے کہ انسانی زندگی لافانیت پر یقین کے بغیر بے سروپائی ہے اور مایوس انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔

"خوشی کے سوال کے جواب میں اور میرے شعور کی ثالثی کے ذریعے مجھے بتایا گیا کہ میں خُدا کے ساتھ ہم آہنگی میں خوش نہیں رہ سکتا، جس کا میں ادراک نہیں کر سکتا اور نہ ہی کبھی اس پوزیشن میں ہو سکتا ہوں کہ اس کا ادراک کر سکوں......"

چنانچہ اس تعلق میں مدّعاعلیہ اور مدّعی کے کردار کو فرض کرتا ہوں، جس میں ملزم اور جج ہیں، چنانچہ میں اس کامیڈی کو فطرت کا مجرمانہ فعل قرار دیتا ہوں جو ایک احمقانہ بات ہے اور

میں اسے سمجھ لیتا ہوں جو میری ذلت کا باعث ہے تاکہ میں از راہ نوازش اسے ادا کر سکوں۔
'مدعی اور مدعا علیہ، جج اور ملزم کی غیر متنازع صلاحیت کے لحاظ سے میں مذمت کرتا ہوں کہ فطرت مجھے ایسے وجود میں تبدیل کر دے تاکہ میں اذیت میں مبتلا ہو سکوں۔ میں اس کی اپنے ساتھ تباہی کی مذمت کرتا ہوں۔'

اس پوزیشن میں کسی حد تک مزاح ہے۔ یہ خود کشی اپنے آپ کو قتل کرتی ہے کیونکہ مابعد الطبیعاتی 'گر' نے پر وہ پریشان ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ اپنا انتقام لیتا ہے۔ اس کا یہ ثابت کرنے کا طریقہ ہے کہ اس کے پاس 'نہیں' ہے۔ یہ عام سی بات ہے کہ اسی موضوع کو مادی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے، تاہم سب سے زیادہ عمومیت کے لحاظ سے دی پوسیسڈ میں دی رکر یلو منطقی خود کشی کی وکالت کرتا ہے۔ انجینئر رکر یلو کہیں اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی جان لینا چاہتا ہے کیونکہ یہ اُس کا خیال ہے۔ ظاہر ہے اس لفظ کو مناسب مفہوم میں سمجھنا چاہیے۔ ایک خیال کے لئے وہ مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ تر خود کشی ہے۔ بتدریج رکر یلو کا ذہن روشن ہوتا جاتا ہے وہ موذی خیال جو اُسے چلا رہا ہے ہم پر نمایاں ہوتا ہے۔ حقیقت میں انجینئر ڈائری کے دلائل کی طرف جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خُدا ضروری ہے اس لئے اُسے ضرور ہونا چاہیے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ وہ واضح کرتا ہے' ''آپ نے اس کو سمجھا کیوں نہیں کہ ایک شخص کو اپنے آپ کو قتل کرنے کے لئے یہی دلیل کافی ہے؟'' یہ رویہ اسی طرح بے سروپائی نتائج کو شامل کرتا ہے۔ لاتعلقی پر قابو پانے کے لئے ہی وہ خود کشی قبول کرتا ہے۔ 'میں نے پچھلی رات فیصلہ کیا کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔' آخر کار وہ اپنے اعمال کو بغاوت اور آزادی کے ملے جلے خیالات کے لئے تیار کرتا ہے۔ 'میں اپنے آپ کو قتل کروں گا تاکہ اپنی نافرمانی کو جتا سکوں، اور اپنی نئی اور خوفناک آزادی کا اظہار کر سکوں۔' یہ انتقامی سوال نہیں ہے بلکہ بغاوتی سوال ہے۔ نتیجتاً رکر یلو (Kirilov) ایک بے سروپائی کردار ہے۔ تاہم اس کا یہ مخصوص حق محفوظ ہے یعنی وہ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ وہ خود بھی تضادات کی وضاحت کرتا ہے اور ایک لحاظ سے اسی وقت ہی وہ اس موذی منطق کو

غیر معمولی ترغیب دیتا ہے جو اس کردار کا پورا تناظر پیش کرتا ہے یعنی وہ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے تا کہ خُدا بن سکے۔

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دلیل سازی کلاسیک حیثیت رکھتی ہے۔ اگر خُدا موجود نہیں ہے تو کریلو خُدا ہے۔ اگر خُدا موجود نہیں تو کریلو کو اپنے آپ کو قتل کرنا چاہیے تا کہ خُدا بن سکے۔ یہ منطق بے سروپائی ہے تاہم یہی وہ منطق ہے جس کی ضرورت ہے۔ دلچسپ بات اس وحدانیت کو معنی دینا ہے جو زمین میں دوز ہو چکی ہے۔ یہ اس مقدمے کو شمار کرنے کی وضاحت کرتی ہے یعنی 'اگر خُدا موجود نہیں تو میں خُدا ہوں' جو اس اعلان کے باوجود دُھندلا ہی رہتا ہے۔ شروع سے ہی اس کو نوٹ کرنا اہم ہے کہ جو شخص اس پاگل دعویٰ کی شیخی بگھارتا ہے اصل میں اس دُنیا کا رہنے والا ہے۔ وہ اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر صبح جمناسٹک کرتا ہے۔ وہ چیتو [Chatov] کی خوشی سے جوش میں آ جاتا ہے جو اپنی بیوی کے صحت یاب ہونے پر خوش تھا۔ موت کے بعد بستر مرگ پر پائی جانے والی کاغذ کی پرچی پر اُس نے خاکہ بنایا ہوا تھا کہ اس کی زبان ایک طرف لٹکی ہوئی ہے۔ اس میں بچپن اور تُند مزاجی، جنوں، باضابطگی اور حساسیت پائی جاتی ہے۔ جس میں سُپر مین کے بارے میں منطق اور جنوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، جب کہ انسان کے لئے اس کے پاس فہرستِ کامل ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو اپنی وحدانیت کی بات کرتا ہے۔ یا تو وہ پاگل ہے یا دوستوفسکی پاگل ہے۔ نتیجتاً یہ کسی خبطی کا سراب نہیں جو اسے اُکساتا ہے۔ جو الفاظ کو مخصوص مفہوم میں لیتا ہے اور اس طرح وہ مضحکہ خیز بنتا ہے۔

کریلو خود بھی ہمیں سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ سٹیوروجن کے سوال کے جواب میں وہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ خُدا۔ انسان کی بات نہیں کرتا۔ شاید یہی سوچا گیا تھا کہ اس کی یہ تشویش یسوع سے امتیاز کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ حقیقت میں یہ یسوع کو اضافی طور پر جوڑنے کا معاملہ ہے۔ حقیقت میں کریلو اپنے آپ کو اس وہم میں مبتلا کر لیتا ہے کہ موت کے وقت یسوع نے اپنے آپ کو جنت میں نہیں پایا تھا۔ اس وقت یسوع کو احساس ہوا کہ اس کا

تشدد بے کار گیا۔ انجینئر کا کہنا ہے کہ 'فطرت کے قانون نے یسوع کو جھوٹ کے درمیان زندہ رہنے کے لئے مجبور کیا اور جھوٹ کے لئے مرنے پر مجبور کیا۔' اس لحاظ سے یسوع پورے انسانی ڈرامے کو شخصی بناتا ہے۔ وہ مکمل آدمی ہے ایک ایسا آدمی جو سب سے زیادہ مضحکہ خیز صورتِ حال کو جان لیتا ہے۔ وہ خُدا۔ انسان نہیں ہے بلکہ انسان۔ خُدا ہے۔ اور ایک مخصوص حد تک ہم سب کو بھی صلیب پر لٹکایا جا سکتا ہے اور ظلم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

زیرِ بحث ربوبیت ارضی بن جاتی ہے۔ کریلو کہتا ہے کہ 'تین سال تک میں نے اپنی ربوبیت کی خصوصیات تلاش کیں اور میں نے ان کو پا بھی لیا۔ میری ابدیت کی خوبی آزادی ہے۔' کیا اب کریلو کے مقدمے کا معنی سمجھا جا سکتا ہے یعنی 'اگر خدا موجود نہیں ہے تو میں خُدا ہوں۔' خُدا بننے کا مطلب اس زمین پر آزاد ہونا ہے تاکہ کسی بھی فانی وجود کی تابعداری نہ کرنی پڑے۔ ظاہر ہے وہ اسی دردناک آزادی سے استنباط کرتے ہیں۔ اگر خُدا موجود ہے تو ہر شے اُسی کی محتاج ہے اور ہم اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ کریلو کے نزدیک نٹشے کی طرح خُدا کو مار دینے کا مطلب ایک شخص کا اپنے آپ کو خُدا بنانا ہے یعنی اس زمین پر ابدی زندگی کو جاننا ہے جس کے بارے میں مقدس کتابیں بولتی ہیں۔ (سٹیوروجن، 'کیا آپ مرنے کے بعد زندہ ہونے پر یقین رکھتے ہو۔' کریلو، 'نہیں میں اسی دُنیا میں ابدی زندگی پر یقین رکھتا ہوں۔')

اگر انسانی تسکین کے لئے یہی مابعد طبعیاتی جُرم کافی ہوتا تو خودکشی کے اضافے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک شخص کیوں قتل کرے اور آزادی جیتنے کے بعد اس دُنیا کو چھوڑ دے؟ یہی تضاد ہے۔ کریلو اس سے باخبر ہے کیونکہ وہ مزید کہتا ہے، ''اگر آپ محسوس کرو، تو آپ زار (روسی بادشاہ) ہو، اور اپنے آپ کو قتل کرنے سے کوسوں دور ہو، آپ شان و شوکت سے گھر میں زندگی گزار سکتے ہو۔'' عام انسان اس منطق کو نہیں جانتے۔ وہ اس کو محسوس بھی نہیں کرتے۔ پرومیتھوس کے دور میں وہ اندھی اُمیدوں کی توا ضع کرتے تھے۔ (انسان نے خُدا اس لئے دریافت کیا تاکہ اپنے آپ کو قتل نہ کرنا پڑے۔ آج تک یہی انسانی تاریخ کا

خلاصہ ہے۔) انہیں راستہ دکھانے کی ضرورت ہے جو تبلیغ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نتیجتاً کریلو کو اپنے آپ کو انسانیت کی محبت کے بغیر قتل کرنا پڑا۔ اس کو اپنے دوستوں اور بھائیوں کو مشکل راستہ دکھانا پڑا جس پر وہ پہلا شہید تھا۔ یہ پیڈ گوجیکل خودکشی تھی۔ تب کریلو اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ اگر اس کو صلیب پر لٹکایا گیا تو وہ مظلوم نہیں ہوگا۔ وہ انسان۔ خدار ہے گا، جو مستقبل کے بغیر موت کا قائل ہوگا وہ مسیحی حُزن سے شرابور ہوگا۔ وہ کہتا ہے، 'میں بالکل خوش نہیں ہوں کیونکہ میں اپنی آزادی کو جتاتا ہوں۔' لیکن ایک دفعہ جب وہ مرجاتا ہے اور انسان روشن خیال بن جاتے ہیں تو یہ دُنیا زاروں سے بھر جاتی ہے اور انسانی عظمت سے چمک اُٹھتی ہے۔ کریلو کے پستول کا فائر آخری انقلاب کا اشارہ تھا۔ اس طرح یہ کوئی مایوسی نہ تھی جو اسے موت کی طرف دھکیل رہی تھی بلکہ اپنے لئے اپنے ہمسائے کی محبت تھی۔ ناقابلِ بیان روحانی مُہم جوئی کو خون خرابے پر ختم کرنے سے پہلے کریلو اتنے ہی قدیم ریمارکس دیتا ہے جتنی انسانی تاریخ ہے، "سب اچھی ہے۔"

دوستوفسکی نے یہ خودکشی کا موضوع بے تکا بنایا ہے۔ کریلو کے صفحہ ہستی سے مٹنے سے پہلے ہمیں دوسرے کرداروں کو بھی نوٹ کرنا چاہیے جنھوں نے مزید بے سروپا موضوعات کا آغاز کیا۔ کریلو اور آئیون کراموزوف نے اپنی عملی زندگی میں بے سروپائی سچائیوں کا آغاز کیا۔ ان کو کریلو کی موت سے آزادی ملی۔ وہ زار ہونے پر اپنی مہارت کا استعمال کرتے ہیں۔ سٹیورجن "ستم ظریفانہ زندگی" بسر کرتا ہے اور اسی لحاظ سے مشہور ہوا۔ وہ اپنے اردگرد نفرت پیدا کرتا ہے۔ بنیادی نقطہ اس کے الوداعی خط میں پایا جاتا ہے 'میں کسی شے سے بھی متنفر نہ ہوسکا۔' وہ بے غرض زار ہے۔ آئیون ذہن کے شاہانہ اختیار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے بھائی کی طرح لوگ اپنی زندگیوں سے ثابت کرتے ہیں کہ عقیدے کی خاطر ایک شخص کی تذلیل ضروری ہے، وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ حالت شرمناک ہے۔ اس کا کلیدی لفظ "ہر شے جائز ہے" کسی حد تک حزن کے سائے میں ہے۔ نٹشے خُدا کا قائل تھا اُس کی طرح اس کا اختتام بھی پاگل پن پر ہوا۔

''ڈائری'' جیسے ناول بے تکے سوالات اُٹھاتے ہیں۔ وہ موت، بُلندی، خوفناک آزادی، زار کی عظمت کے انسانی بننے تک منطق قائم رکھتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے، ہر چیز کی اجازت ہے اور کوئی شے نفرت کے لائق نہیں۔ یہ بے سر وپائی ججمنٹ ہے۔ مگر وہ کونسی تخلیق ہے جس میں آگ اور برف کی مخلوق ہمیں اتنی مانوس معلوم ہوتی ہے۔ لاتعلقی کی یہ تُند مزاج دُنیا ان کے دلوں میں گرجتی ہے، ہمیں عجوبہ صفت معلوم ہوتی ہے۔ ہم اس میں اپنی روزمرّہ کی بے تابیوں کی پہچان کرتے ہیں۔ دوستوفسکی کے علاوہ کسی نے بے سروپائی دُنیا کو اتنا تکلیف دہ اور مانوس سحر نہیں بخشا ہوگا۔

اُس کا نتیجہ کیا تھا؟ دو اقتباسات مکمل مابعد الطبیعاتی کایا پلٹ دکھاتے ہیں جو مصنّف کو دوسرے انکشافات کی طرف لے جاتے ہیں۔ منطقی خودکشی کرنے والے کے دلائل نے نقادوں کے احتجاج کو جنم دیا۔ دوستوفسکی ڈائری کی اس قسط میں کہتا ہے کہ 'اگر بنی نوع انسان کا لافانیت پر عقیدہ اتنا ہی ضروری ہے (کہ اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو قتل کرنے کے نتیجے پر پہنچ جاتا ہے) تو انسانیت کی حالت نارمل ہونی چاہیے۔ اس حالت میں انسانی روح کی لافانیت بغیر شک وشبہ کے موجود ہے۔' اس کے آخری ناول کے آخری صفحات میں دوبارہ خُدا کے ساتھ عظیم معرکہ آرائی میں کچھ بچے الوشا سے پوچھتے ہیں، ''کراموزوف کیا جو مذہب کہتا ہے وہ سچ ہے کہ موت کے بعد اُٹھالیا جائے گا اور ہم دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے؟'' الوشا جواب دیتا ہے، ''یقیناً ہم ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھ سکیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو بڑی خوشی کے ساتھ بتا سکیں گے جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔''

اس طرح کریلو، سٹوروجن اور آئیون تینوں کو شکست ہوتی ہے۔ برادرز کراموزوف (ناول) دی پوسیسڈ (ناول) کا جواب دیتا ہے۔ حقیقت میں یہی ماحاصل ہے۔ پرنس موچکن سوئم کے حوالے سے الوشا کا معاملہ مُبہم نہیں ہے۔ مؤخرالذکر دوامی حالت میں رہتا ہے، جس میں لاتعلقی اور مُسکراہٹ کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ مسرور حالت ابدی زندگی ہو جس کے بارے میں پرنس مخاطب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس الوشا واضح طور پر کہتا

ہے، ''ہم دوبارہ ملیں گے۔'' خود کشی اور پاگل پن کا سوال ہی نہیں۔ جس شخص کو لافانیت اور خوشیوں پر یقین ہے اس کا استعمال کیا ہو سکتا ہے؟ انسان اپنی ابدیت کا خوشیوں کے بدلے تبادلہ کرتا ہے۔ 'ہم خوشی سے ایک دوسرے کو بتا سکیں گے جو کچھ ہوا ہے۔' ایک دفعہ پھر کریلوف کا پستول روس کے کسی علاقے میں دوبارہ گونج اُٹھتا ہے، لیکن دُنیا اپنی اندھی اُمیدوں کی چاشنی کو جاری رکھتی ہے۔ انسان اس کو سمجھ نہیں پاتے۔

نتیجتاً یہ کوئی بے سروپا ناول نہیں تھا جو ہمیں مخاطب کر رہا تھا بلکہ یہ ایک موجودیاتی ناول تھا۔ اس کی جست اپنی شرافت آرٹ کو دے رہی تھی جس سے یہ متاثر تھی۔ یہ رضامندی میں ہلکی سی جُنبش پیدا کرتی ہے جو شکوک، بے یقینی اور جوش سے چھلنی ہے۔ برادرز کراموزوف کے بارے میں بات کرتے ہوئے دوستوفسکی نے لکھا تھا، ''اس پوری کتاب میں جس بنیادی سوال کا کھوج لگایا جائے گا وہ بنیادی سوال ہو گا جس کی وجہ سے میں خود بھی پوری زندگی شعوری یا غیر شعوری وجہ سے مُبتلا رہا ہوں یعنی خُدا کی ذات کی موجودیت کے بارے میں۔' پوری زندگی کی اذیت کو مُسرّت سے بھرپور یقین میں ایک ناول میں تبدیل کرنا ناقابلِ یقین بات ہے۔ دوستوفسکی کے ایک نقاد کا کہنا تھا کہ دوستوفسکی آئیون کا طرفدار ہے اور ان تائیدی ابواب لکھنے کے لئے تین ماہ لگے جب کہ اس کے 'بے ادبانہ (کفر بکنے والے) ابواب لکھنے کے لئے صرف تین ہفتے درکار تھے۔ اس کا کوئی بھی کردار ایسا نہیں جو اُس کے لئے سوہانِ روح ہو، جو اس میں مبالغہ پیدا نہ کرتا ہو یا حساسیت کی تلافی نہ کرتا ہو یا غیر فانیت کی تلاش میں نہ ہو (جیڈ نے کہا تھا کہ دوستوفسکی کے تمام ہیرو کثیر الازدواج کے عادی ہیں) بہر حال ہم اس شک کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ یہ ایسا آرٹ ہے جس میں دن کی روشنی کی نسبت دھوپ چھاؤں زیادہ دکھائی گئی ہے۔ ہمیں موقع دیا جاتا ہے کہ ہم انسان کی اُمیدوں کے برعکس اس کی جدوجہد کو اپنی گرفت میں لیں۔ اختتام تک پہنچتے ہوئے، تخلیق کار اپنے کرداروں کے خلاف اپنا انتخاب کرتا ہے۔ یہی تضادات ہمیں امتیاز کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ بے سروپا کام نہیں ہے جس کو یہاں پر

شامل کیا گیا ہے بلکہ ایسا کام ہے جو بے سروپائی مسئلہ کو گہرائی بخشتا ہے۔ سٹیور جن کے مطابق دوستوفسکی کا جواب تذلیل اور شرم میں ہے۔ اس کے برعکس بے سروپا کام جواب نہیں دیتا یہی اہم فرق ہے۔ اس کے ماحاصل کا احتیاط سے جائزہ لیتے ہیں یعنی بے سروپا شخص کو اس کام میں جو چیز متضاد بناتی ہے وہ اس کا مسیحائی کردار نہیں بلکہ آخرت کا اعلان ہے۔ ایسے عیسائیوں کی مثالیں بھی ہیں جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے۔ آرٹ کے کام کے حوالے سے یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بے سروپائی تجزیے کی ایک دُنیا کا تعین کیا جائے جن کی سابقہ صفحات میں پیش بینی کی گئی ہے۔ یہ ''انجیل کی بے سروپائی'' کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ اس خیال پر روشنی ڈالتی ہے، جو صدائے بازگشت میں زرخیز ہے اور یقین بے اعتقادی پیدا ہونے کو نہیں روک سکتے۔ اس کے برعکس یہ دیکھنا آسان ہے کہ دی پوسیسڈ کا مصنف جن راستوں سے مانوس ہے اس سے مختلف راستہ اپناتا ہے۔ تخلیق کار کا اپنے کردار کو حیران کُن جواب یعنی دوستوفسکی کا رکریلو کو جواب مندرجہ ذیل جملے میں مختصراً پیش کیا جاسکتا ہے یعنی موجودیت فریب دہ ہے اور یہ دوامی ہے۔

عارضی تخلیق

اس نقطے پر مجھے ادراک ہوا کہ اُمید چپکے سے دامن نہیں بچاسکتی حتیٰ کہ یہ اُن کا بھی محاصرہ کرلیتی ہے جو اس سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس نقطے تک زیرِ بحث موضوع میں میں نے تو یہی دلچسپی پائی ہے۔ میں تخلیق کے دھارے میں کچھ سچے بے سروپا کاموں کی فہرست بھی بناؤں گا۔ ہر شے کا آغاز ہونا چاہیے۔ اس پیاس کا موضوع وفاداری ہے۔ چرچ بدعتی لوگوں پر بہت نالاں تھا کیونکہ اس کے نزدیک گمراہ بچے سے بڑا کوئی دُشمن نہیں ہوتا۔ عرفانیون کی دیدہ دلیری کا ریکارڈ موجود ہے۔ رومانویت پرستوں کے استقلال نے آرتھوڈوکس کی تعمیر میں خاصی حصہ داری ڈالی۔ اگر اجازت ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہی بات بے سروپائی پر بھی درست آتی ہے۔ ایک شخص کے راستے کو ایسا راستہ دریافت کرنے کے

ذریعے پہچانا جاسکتا ہے جو اس کو گمراہ کرتا ہے۔ بے سروپائی کے نتیجے میں سامنے آنے والے رویے اس کی منطق کے ماتحت ہوتے ہیں۔ بے سروپائی میں اُمید کو پانا ناممکن ہے۔ سب سے بالاتر ناگزیر وفاداری جو کسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور مضمون کے عمومی پلان کی تائید کرتی ہے۔

بے سروپا کاموں کی فہرست بنانا قبل از وقت ہے، کم از کم تخلیقی رویے کے طور پر نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جو مکمل بے سروپائی موجودیت کو مکمل کرتا ہے۔ آرٹ کی جتنی منفی فکر نے خدمت کی اتنی کسی دوسری فکر نے نہیں کی ہوگی۔ جس طرح سفید رنگ کو سمجھنے کے لئے کالا رنگ ضروری ہوتا ہے اسی طرح عظیم فن پاروں کو سمجھنے کے لئے اس کے تذلیل شدہ اور اندھیرے آرٹ کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ 'عدم' کے لئے کام کرنا اور تخلیق کرنا، مٹی سے سنگ تراشی کرنا، یہ جاننا کہ اس کی تخلیق کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں، اس بات کو سمجھ لینا کہ اس کا پورا آرٹ ایک دن میں تباہ کیا جاسکتا ہے، ساتھ ساتھ بنیادی طور پر اس کو سمجھنا کہ اس کی اہمیت صدیوں میں تعمیر کرنے کے برابر ہے۔ یہ مشکل دانائی ہے جو فکر کی منظوری دیتی ہے۔ دونوں ذمہ داریاں ایک ساتھ نبھانا، ایک طرف انکار کرنا اور دوسری طرف اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا راستہ بے سروپائی تخلیق کار کے لئے کھلا ہے۔

یہ خیال مخصوص آرٹ کی رہنمائی کرتا ہے۔ اکثر تخلیق کاروں کے کام بکھرے ہوئے ثبوتوں کے طور پر موجود ہیں۔ فنکار اور ادیب دونوں پریشان ہیں۔ ایک گہری فکر ہونے کی مسلسل حالت میں ہے اور اس میں زندگی کے تجربے کو اختیار کرتا ہے اور اس کی شکل کو فرض کرتا ہے۔ انسان کی واحد تخلیق کو اس کے کثیر العناصر اور مسلسل پہلوؤں کے ذریعے توانائی بخشی جاتی ہے۔ تخلیق ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہے، ایک دوسرے کی تصحیح کرتی ہے اور ایک دوسرے کا متضاد پیش کرتی ہے۔ اگر کوئی شے تخلیق کو اپنے مقصد تک لاتی ہے تو یہ اندھے آرٹسٹ کی فتحیاب اور سراب زدہ چیخ نہیں ہوتی بلکہ "تخلیق کار کی موت تجربے اور

اس کی ذکاوت کو بند کرتی ہے۔''

ضروری نہیں کہ یہ کوشش اور فوق الانسانی شعور قاری پر ظاہر ہو۔ انسانی تخلیق میں کوئی راز نہیں ہے۔ ارادہ اس معجزے کو سرانجام دیتا ہے۔ مگر راز کے بغیر سچی تخلیق نہیں ہوتی۔ کام کا تسلسل اسی فکر کی مشابہت کا سلسلہ ہے۔ کارروائی کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے تخلیق کار کا ادراک کرنا ممکن ہے جس کا کام باہمی تعلقات سے محروم ہے۔ خاص حد تک وہ متضاد ہیں۔ مگر سب کو دیکھتے ہوئے اپنے فطری گروپوں کو بحال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر موت سے وہ اپنی اہمیت اخذ کرتے ہیں۔

وہ اپنے مصنف سے زندگی کے بنیادی معنی اخذ کرتے ہیں۔ موت کے وقت ان کے کاموں کا سلسلہ ناکامیوں کے مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ تاہم اگر ان تمام ناکامیوں کی ایک ہی جیسی گونج ہو تو تخلیق کار اپنی حالت کی شبیہ کو دُہرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ملکیت میں بانجھ راز سے فضا میں گونج پیدا کرتا۔

یہاں پر غلبے کا رجحان نمایاں ہے۔ تاہم انسانی ذہانت کا کردار اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تخلیق کے صرف رضاکارانہ پہلو کو بیان کرتا ہے۔ کہیں پر میں نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ انسانی ارادے کا آگہی پیدا کرنے کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس کو ڈسپلن کے بغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ صبر اور معقولیت کے تمام مکتبہ فکر کے نزدیک تخلیق سب سے مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ اپنی حالت کے خلاف مستقل مزاج بغاوت، ایک ایسی کوشش کے سامنے استقلال کا مظاہرہ کرنا جو بانجھ ہو انسانی عظمت کی لڑکھڑاتی ہوئی شہادت ہے۔ یہ روز مرّہ کوشش، تکمیلِ ذات، سچائی کی حدود کا جامع اندازہ، پیمائش اور طاقت کا بلاوا ہے..... عدم کے لئے خاموشی سے انتظار کرنا ہے۔ اس آزمائش کی نسبت بذاتِ خود عظیم کام کی اہمیت کم ہے۔ جس کا انسان سے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنے بھوت پریت پر غالب آنے کے لئے موقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ ننگی حقیقت کے قریب پہنچ سکے۔

جمالیات میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ میں جس مقالے کی فرمائش کر رہا ہوں اس کی تحقیق اور شرح مشکل ہے۔ اس کے برعکس میں نے اپنے آپ کو واضح طور پر سمجھنے کی

کوشش کی ہے۔ یہ مقالاتی۔ ناول، وہ کام جس کو ثابت کیا گیا ہے، جو سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے وہ کام ہے جو اکثر خود رو فکر سے متاثر ہوتا ہے۔ جس سچائی کی ملکیت کا آپ کو یقین ہوتا ہے آپ اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جن خیالات کا ایک شخص مظاہرہ کرتا ہے اور فکر ان خیالات کے برعکس ہوتی ہے وہ تخلیقی فلاسفروں کو جنم دیتی ہے جو اپنے آپ سے شرمندہ ہوتے ہیں۔ میں جن کی بات کر رہا ہوں یا جن کے بارے میں سوچ رہا ہوں اس کے برعکس روشن خیال مفکر ہوتے ہیں۔ خاص نقطے پر فکر اپنی طرف واپس لوٹ جاتی ہے، جہاں سے وہ اپنے کاموں کی شکل اُبھارتی ہے جو محدود، فانی اور باغیانہ فکر کی ظاہری علامتیں ہوتی ہیں۔

شاید یہ علامتیں کچھ ثابت کرتی ہیں یا نہیں مگر یہ ثبوت ایسے ہیں جو ناول نگار دُنیا کی بجائے اپنے لئے فراہم کرتا ہے۔ ناول نگاروں کو ٹھوس پر فتح یاب ہونا چاہیے اور اسی کامیابی کو اُن کی شان وشوکت تشکیل دینی چاہیے۔ کُلی نفسیاتی کامرانی ان کے لئے فکر نے تیار کی ہے جس میں تجرد قوتوں کی تذلیل کی گئی ہے۔ جب وہ مکمل طور پر ایسے بنتے ہیں تو جسم تخلیق کو بے سروپائی میں چکا چوند بنا دیتا ہے۔ آخر ستم ظریفانہ فلسفہ جنون پیدا کرتا ہے۔

کسی حد تک فکر وحدانیت کو روکتی ہے اور تنوع کو شان وشوکت بخشتی ہے۔ تنوع آرٹ کا گھر ہے۔ جو فکر ذہن کو آزاد کراتی ہے اور اس کو تنہا چھوڑتی ہے وہ حدود کو شک سے مبرّا کرتی ہے اور مقصد کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ کوئی بھی اصول اس کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ زندگی آرٹ کی پختگی کا انتظار کرتی۔ اس سے جُدا ایک بار پھر کام اُمید سے ہمیشہ کیلئے آزاد روح کو ڈھانپنے والی آواز دیتا ہے یا پھر کسی کو آواز نہیں دیتا۔ اگر تخلیق کار تھکاوٹ سے چور اس سے منہ موڑ لیتا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میں بے سروپائی تخلیق سے استفسار کرتا ہوں جو مجھے فکر، بغاوت، آزادی اور تنوع سے درکار ہوتا ہے۔ بعد میں یہ اپنے بانجھ پن کو عیاں کرتا ہے۔ روزانہ رزق کمانے کے لئے کی گئی کوشش جس میں ذہانت اور جنوں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی حمایت

کرتے ہیں جس سے بے سروپا انسان ڈسپلن دریافت کرتا ہے جو اس کی سب سے عظیم ترین قوت بنتی ہے۔ اس طرح مطلوبہ تُندہی، اکھڑ پن اور معقولیت فاتح کے رویہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ تخلیق کرنے کا مطلب ایک شخص کی قسمت بنانا ہے۔ ان تمام کرداروں کے لئے ان کا کام تعین کرتا ہے کم از کم جتنا یہ تعین کرتے ہیں۔ اداکار ہمیں سکھاتا ہے کہ وجود اور ظاہر ہونے میں کوئی حدود باقی نہیں ہیں۔

اس میں سے کسی کے بھی حقیقی معنی نہیں ہیں۔ آزادی کے اس طرف ترقی کرنا باقی ہے۔ ان متعلقہ ذہنوں کی آخری کوشش خواہ وہ تخلیق کار کی ہو یا فاتح کی ہو یا اپنے ہی دائرہ اختیار سے اپنے آپ کو آزاد کراتی ہے اور قربانی دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے، خواہ یہ قربانی محبت کی شکل میں ہو، فتح کی شکل میں ہو یا تخلیق کی شکل میں ہو تاہم خیال رکھنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کی پوری زندگی بے حاصلی کو ہضم کر جائے۔ آرٹ کی پریکٹس کے دوران ایک انسان کو اسی طرح آزادی ملتی ہے جس طرح بے سروپائی سے آگہی تجاوز میں غوطہ زن ہونے کا موقع دیتی ہے۔

باقی صرف قسمت بچتی ہے جس کا ماحاصل موذی ہوتا ہے۔ موت کے اِس موذی پن سے باہر خوشی اور مسرّت آزادی ہے۔ جس شخص کی یہ دُنیا ہے وہی اس کا ماسٹر ہے۔ جو چیز اس کو باندھتی ہے وہ دوسری دُنیا کا سراب ہے۔ اس فکر کا نتیجہ تارک الدُنیا اور پھولوں کے عکس پر ختم ہوتا ہے۔ یہ فکر رنگ رلیاں مناتی ہے۔ افسانوں میں۔ افسانے انسانی آلام کے علاوہ ناقابلِ فنا ہوتے ہیں نہ کہ وہ خُدائی کہانی جو محظوظ اور اندھا کرتی ہے جس کے ارضی چہرے، اظہار اور ڈرامے میں دانائی اور عارضی جنوں کو جمع کیا گیا ہے۔

O

سسی فس کا افسانہ

جس دیوتا نے سسی فس کو سزا دی تھی کہ وہ ایک پتھر کو گھماتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر لے جائے جہاں سے پتھر اپنے ہی وزن پر نیچے گر جائے گا۔ اس دیوتا نے کسی طرح سوچا تھا کہ سب سے خوفناک سزا بے کار اور بانجھ محنت ہی ہو سکتی ہے۔

اگر ایک شخص ہومر پر یقین کرے تو سسی فس تمام فانی لوگوں میں سب سے زیادہ دانا اور سیانا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق اس کو ہائی وے پر کام کرنے والے انسان کی طرح پریکٹس کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ مجھے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ ہمارے سامنے مختلف رائے آ سکتی ہیں کہ اسے کیوں زیرِ زمیں بے ثمر مزدور بنایا گیا۔ وہ دیوتاؤں کی ہرزہ سرائی کی بدولت زیرِ عتاب آیا تھا۔ اُس نے دیوتاؤں کے راز چرائے تھے۔ ایسوپ کی بیٹی ایجینا کو جیوپٹر نے اغوا کیا تھا۔ اس کے اغوا ہونے پر باپ بہت افسردہ تھا۔ اُس نے سسی فس کے سامنے رونا رویا۔ سسی فس اغوا کے بارے میں جانتا تھا، اُس نے ایک شرط پر ایجینا کے بارے میں بتانا منظور کیا کہ ایسوپ کورنتھ کے قلعے میں پانی فراہم کرے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت کے قریب سسی فس ناعاقبت اندیشی سے اپنی بیوی کی محبت ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اس کی لاش دفن کرنے کی بجائے چوک میں رکھ دے۔ سسی فس زیرِ زمین جاگ گیا۔ انسانی محبت کے برعکس تابعداری سے خفا ہو کر اس نے پلوٹو سے زمین پر دوبارہ آنے کی اجازت لی تا کہ اپنی بیوی کو سزا دے سکے۔

جب اُس نے دوبارہ اس زمین کا چہرہ دیکھا جو سورج اور پانی، گرم پتھروں اور سمندر کی لہروں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ جہنم کے اندھیروں میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ بار بار کے بلاوے اور وارننگ بھی اسے قائل نہ کر سکے۔ کئی سال وہ زمین کی مُسکراہٹیں اور دمکتے ہوئے سمندر اور خمدار خلیج میں زندگی کے مزے لیتا رہا۔ دیوتا کا حکم ضروری تھا۔ دیوتاؤں کا قاصد آیا، نافرمان انسان کو کالر سے پکڑا اور اس سے اُس کی خوشیاں چھین لیں۔ اس کو زبردستی زیرِ زمین واپس جانے کے لئے مجبور کیا جہاں پر اس کی سزا کے لئے چٹان تیار تھی۔

آپ نے پہلے ہی سمجھ لیا ہے کہ یہ سسی فس بے سروپا ہیرو ہے۔ جس طرح وہ اپنے جنوں سے گزرا تھا اسی طرح اسے اذیت سے گزارا گیا۔ اُس کی دیوتاؤں پر ہرزہ سرائی، اُس کی موت سے نفرت اور اس کی زندگی کے لئے دیوانگی اس کی ناقابل بیان سزا کا باعث بنی جس میں پورے وجود کو لاشے (بے ثمری، بے حاصلی) کی تکمیل کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ زمین کی فریفتگی کے لئے ایک شخص کو یہی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ زیرزمین سسی فس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ افسانے گھڑے جاتے ہیں تاکہ ان کے اندر تخیل سانس لے سکے۔ اس افسانے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک جسم بہت بڑے پتھر کو گھسیٹتا ہوا اوپر لے جا رہا ہے تاکہ وہ سینکڑوں دفعہ اس کو اوپر لے جا کر نیچے گرا سکے۔ ایک شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس کا چہرہ تنا ہوا اور گال پتھر کے ساتھ چپکے ہوئے اور کاندھے پتھر کے ساتھ چمٹے ہوئے، پاؤں زمین میں ٹھونسے ہوئے اور پھیلے ہوئے بازوں کے ساتھ دوبارہ آغاز کیا جاتا ہے۔ وسیع وعریض زماں اور مکاں کے پیٹ میں اس کی طویل کاوش کے آخر میں مقصد حاصل کیا جاتا ہے جو سخت مشقت کا حاصل ہوتا ہے۔ تب سسی فس اس پتھر کو تیزی سے نیچے زمین کی طرف لڑھکتے ہوئے دیکھتا ہے جہاں سے اُسے دوبارہ دھکیل کر اسی اوپر والی جگہ پر لانا ہے۔ وہ یہی عمل دوبارہ دُہراتا ہے۔

اسی دورانیے اور وقفے کے دوران جہاں پر وہ ایک لمحے کے لئے رُکتا ہے یہی وہ منظر

ہے جس نے میری دلچسپی میں اضافہ کیا۔ جو چہرہ پتھر کے ساتھ چمٹا ہوا ہے وہ پہلے ہی پتھر بن چکا ہے۔ میں اس آدمی کو سمجھ سکتا ہوں جو تھکاوٹ کے ساتھ اسی سزا کی طرف دوبارہ جا رہا ہے جس کے اختتام کے بارے میں وہ جانتا نہیں۔ وہ دم بھر کی فرصت جو اس کی تکلیف کے ساتھ ہی واپس لوٹتی ہے یہی اس کے شعور اُبھرنے کا وقت ہوتا ہے۔ ان لمحات میں سے ہر لمحے جب وہ اس اونچائی کو دیکھتا ہے اور آہستہ آہستہ دیوتاؤں کی راحت کے بارے میں بیدار ہوتا ہے، وہ اپنی قسمت سے برتر ہوتا ہے۔ وہ چٹان سے بھی مضبوط ہے۔

اگر یہ افسانہ المیہ ہے کیونکہ اس کا ہیرو صاحبِ شعور ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اذیت کہاں موجود ہے، درحقیقت ہر قدم پر اُمید اسے جا لیتی ہے؟ آج کا مزدور اپنی پوری زندگی کام کرتا رہتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں اور لکھی ہوئی تقدیر بے سروپائی سے ماورا نہیں ہے۔ تاہم یہ بہت ہی کم اوقات میں بے سروپائی بنتی ہے جب یہ اپنا شعور حاصل کرتی ہے۔ سسی فس جو دیوتاؤں کے نزدیک محکوم، بے یارو مددگار اور باغی ہے اپنی خستہ حالت کے بارے میں باخبر ہے، وہ اپنے تنزل کے وقت یہی جانتا تھا۔ اُس کا وضاحتی بیان جو اس پر تشدد کا باعث بنا ساتھ ساتھ فتح کا تاج بھی اس کے سر پر پہناتا ہے۔ کوئی بھی قسمت ایسی نہیں ہے جس پر نفرت سے غالب نہ آیا جا سکے۔

اگر بعض اوقات تنزل دکھوں کا باعث بنتا ہے تو یہ خوشی میں بھی ہو سکتا ہے۔ دُنیا کافی نہیں ہے۔ میں ایک بار پھر سسی فس سے متاثر ہوں جو اپنی چٹان کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اس کے دُکھ کام کے آغاز میں دکھائے گئے ہیں۔ جب زمین کا خیال یاد سے چپک جاتا ہے، جب خوشیوں کا بلاوا ضد اختیار کر لیتا ہے تو حُزن انسان کے دل میں اُبھرتا ہے یہی چٹان کی فتح ہوتی ہے اور یہ بذاتِ خود چٹان ہوتی ہے۔ بے پایاں دُکھ اتنا بھاری ہے کہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ یہی ہماری راتوں میں بس جاتا ہے۔ وجود سے خارج کچلنے والی سچائیوں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ابتداء میں اوڈی پس بغیر جانتے ہوئے قسمت کی تابعداری کرتا

ہے۔تاہم جس لمحے وہ باخبر ہوتا ہے اس کا المیہ شروع ہوتا ہے۔وہ اندھا اور مایوس یہ ادراک کرتا ہے کہ صرف ایک ہی تعلق اسے دُنیا سے جوڑتا ہے وہ اس لڑکی کے ٹھنڈے ہاتھ ہیں۔ اس کے بعد ایک زبردست آواز آتی ہے، ''اتنی زیادہ جسمانی اذیت کے باوجود میری بڑھتی ہوئی عمر اور روح کی عالی ظرفی یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔'' سوفکلز، اوڈیپس دوستوفسکی کے کریلو کی طرح بے سروپائی فتح کے لئے نسخہ تجویز کرتے ہیں۔قدیم دانائی جدید ہیروازم کی تائید کرتی ہے۔

ایک شخص خوشی کے مینوئل لکھنے کی ترغیب پائے بغیر بے سروپائی کو دریافت نہیں کر سکتا۔کیا خوشی اس قسم کے تنگ ذریعوں سے دریافت کی جا سکتی ہے؟ صرف ایک تو دُنیا ہے۔خوشی اور بے سروپائی ایک ہی زمین کے دو سپوت ہیں۔وہ ناقابلِ جُدا ہیں۔یہ کہنا غلط ہوگا کہ خوشیاں لازماً بے سروپائی دریافت سے پیدا ہوتی ہیں۔بے سروپائی کے احساسات خوشیوں سے پھوٹتے ہیں۔اوڈیپس کہتا ہے کہ میرا نتیجہ یہ ہے کہ سب ٹھیک ہے اور اس کا یہ ریمارکس بہت مقدس ہے۔یہ آواز انسان کی محدود اور جنگلی دُنیا میں گونجتی ہے۔یہ ہمیں بتاتی ہے کہ سب کچھ فنا نہیں ہوا ہے۔یہ اس دُنیا میں ایک ایسے خدا کو اخذ کرتی ہے جو اس کے ساتھ عدم اطمینان اور بے سود مصائب کے ذریعے اخذ ہوتی ہے۔یہ دُکھ اور سُکھ قسمت کو انسانی بناتے ہیں جس کو انسانوں کے درمیان حل کرنے کی ضرورت ہے۔

سسی فس کی خاموش مسرّت اسی میں شامل ہے۔اس کی تقدیر اس کی ملکیت ہے۔ اس کی چٹان اس کی چیز ہے۔اسی طرز پر جب بے سروپا انسان اپنی اذیت پر غور وفکر کرتا ہے تو تمام بتوں کو خاموش کرا دیتا ہے۔کائنات اچانک اس کی خاموشی کو بحال کرتی ہے، زمین پر جمِ غفیر کی چھوٹی چھوٹی آوازیں اُٹھنا شروع ہوتی ہیں۔لاشعور، خفیہ بلاوے، تمام چہروں کی طرف سے دعوت نامے، فتح کی قیمت اور ناگزیر کایا پلٹ ہوتی ہے۔سورج کے بغیر کوئی سایہ نہیں ہے جو رات کی پہچان کیلئے بہت ضروری ہے۔بے سروپا انسان ہاں کہتا ہے اور اس کی کوشش لامحدود ہو جاتی ہے۔اگر ذاتی قسمت ہوتی تو برتر تقدیر نہ ہوتی یا کم از کم اٹل اور

قابلِ حقارت ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا خود مالک ہے۔ اس نازک لمحے پر جب انسان اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہے۔

سسی فس اپنی چٹان کی طرف لوٹتا ہے، اس مختصر محور میں وہ بکھرے ہوئے اعمال کے سلسلے پر غور کرتا ہے جو اس کی تقدیر بنتے ہیں، جن کو وہ خود ہی تخلیق کرتا ہے اس کی یاداشت میں جمع ہوتے ہیں اور جلد ہی موت اس کو سیل بند کر دیتی ہے۔ تمام انسانوں کی بطور انسان ابتداء کے بارے میں قائل ہوتے ہوئے ایک اندھا انسان دیکھنے کے لئے مشتاق ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ اس کے سامنے اندھیری رات کا اختتام نہیں ہے اب بھی اس کو اسی طرح آگے بڑھنا ہے۔ پتھر کو اب بھی دھکیلنا ہے۔

میں افسوس کے ساتھ سسی فس کو پہاڑی کے چرنوں میں چھوڑتا ہوں۔ ایک شخص ہمیشہ ایک شخص کے بوجھ کو دوبارہ پا سکتا ہے۔ سسی فس اعلیٰ فرض شناسی کا درس دیتا ہے۔ یہ سبق دیوتاؤں کی نفی کرتا ہے اور پتھروں کو اٹھاتا ہے۔ وہ بھی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ مالک کے بغیر اس کو کائنات نہ تو بانجھ نظر آتی ہے اور نہ ہی بے ثمر نظر آتی ہے۔ اس پتھر کا ہر ایٹم، پہاڑوں سے بھری ہوئی رات کی معدنیات کا ہر تودہ بذاتِ خود دُنیا کی تشکیل کرتا ہے۔ بُلندیوں کی طرف بذاتِ خود جدوجہد انسانی دل کو بھرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ سسی فس خوش ہے۔

O

فرانز کافکا: اُمید اور بے سروپائی

کافکا کے پورے آرٹ کا مقصد قاری کو مجبور کرنا ہے کہ وہ اس کے ناولوں کو دوبارہ پڑھے۔ اس کا اختتام یا اختتام کے بغیر وضاحتیں تجویز کرتی ہیں کہ ان کا اظہار واضح زبان میں نہیں کیا گیا، لیکن اس سے پہلے کہ ان کی تائید کی جائے، قاری سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو دوسرے نقطہ نظر سے دوبارہ پڑھے۔ بعض اوقات دوہری شرح کا امکان ہوتا ہے، جو دوہری پڑھائی کی ضرورت کو اُبھارتا ہے۔ ایک مصنّف یہی چاہتا ہے۔ کافکا کے کام کی تفصیل کے ساتھ ہر چیز کی دوہری شرح غلط ہوگی۔ علامت عمومی ہوتی ہے اس کا ترجمہ کتنا بھی جامع ہو ایک فنکار اس کو صرف حرکات وسکنات تک ہی بحال رکھ سکتا ہے۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ علامتی کام کو سمجھنے سے زیادہ کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔ جو شخص علامت کا استعمال کرتا ہے علامت اس سے ہمیشہ ماورا ہو جاتی ہے اور اس کو حقیقت میں وہ کچھ کہنے پر مجبور کرتی ہے جس کا وہ اظہار کرنے کے بارے میں باخبر ہوتا ہے۔ اس کو اپنی گرفت میں لینے کا سب سے یقینی طریقہ اس کو مشتعل کرنا ہوتا ہے۔ ادراک کے بغیر کام اور اس کے حالیہ رجحان کو دیکھنا خاص طور پر کافکا کے نزدیک اس کے اصولوں کے ساتھ متفق ہونا کافی ہے، اس کی خارجیت کے ذریعے ڈرامے تک رسائی کرنا اور شکل کے ذریعے ناول تک رسائی کرنا مناسب ہے۔

پہلی نظر میں ہی عام قاری کے نزدیک اُلجھن پیدا کرنے والی مہم جوئی ہے جو ایک جذباتی اور ٹھیٹ قسم کے کردار کو مسئلے کے حل کی تلاش کے لئے سرگرم دکھاتی ہے جو کبھی حل

نہیں ہوتی۔ٹرائل (آزمائش) میں جوزف مجرم ہے۔مگر وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ مجرم کیوں ہے۔بے شک وہ اپنا دفاع کرنے پر مُصر ہے، لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے۔وکلاء کو اس کا مقدمہ بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔اسی اثناء میں وہ محبت کرنے، کھانے پینے اور اخبار پڑھنے سے بالکل غافل نہیں ہوتا۔تب اس کو جج کیا جاتا ہے۔عدالتی کمرے میں گھپ اندھیرا ہے۔اسے زیادہ سمجھ نہیں آتی۔وہ صرف یہ فرض کرتا ہے کہ اسے مجرم قرار دیا گیا ہے تاہم کس جُرم میں، وہ اس پر حیران اور پریشان ہے۔بعض اوقات وہ اس پر شک کرتا ہے۔وہ زندہ رہنا جاری رکھتا ہے۔بعض اوقات دو شریف لوگ اسے پکڑنے آتے ہیں اور اس کو کہتے ہیں کہ وہ ان کے پیچھے آئے۔انتہائی خوش خلقی کے ساتھ وہ اسے خستہ قصبے میں لے جاتے ہیں۔اس کا سر ایک پتھر پر رکھتے ہیں اور گلا کاٹ دیتے ہیں۔مرنے سے پہلے ملزم صرف اتنا کہتا ہے، ''کتے کی طرح۔''

آپ دیکھ سکتے ہو کہ کسی کہانی میں علامت کے بارے میں بات کرنا آسان نہیں ہے بلکہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے جس کا ظاہری معیار بے ساختگی ہوتی ہے۔تاہم بے ساختگی سمجھنے کے لئے مشکل کیٹگری ہے۔بہت سے ناول اور افسانے ایسے ہیں جن میں ایک واقعہ قاری کو فطری معلوم ہوتا ہے۔کچھ ناول ایسے ہوتے ہیں جن میں کرداروں کے ساتھ جو بھی کیا جاتا ہے وہ اس کو فطری سمجھتے ہیں۔جتنی کردار کی مہم جوئی غیر معمولی ہو گی اتنی ہی کہانی فطری ہو گی۔اس انتشار کے تناسب سے ہم انسانی زندگی کی اجنبیت اور سادگی کو محسوس کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ شخص اس کو قبول کرتا ہے۔یہی بے ساختگی کافکا میں پائی جاتی ہے۔ایک شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ دی ٹرائل کا مطلب کیا ہے۔لوگوں نے انسانی حالت کے بارے میں بات کی ہے۔یقیناً یہ ایک سادہ اور پیچیدہ بات ہے۔میرا مطلب ہے کہ ناول کی وقعت کافکا کے لئے زیادہ اہم اور مخصوص ہے۔کسی حد تک یہی وہ شخص ہے جو بات کرتا ہے تاہم یہ اہم ہے جن کی زبان میں وہ اقرار کرتا ہے۔وہ زندہ رہتا ہے اور مجرم قرار دیا جاتا ہے۔وہ اپنے ناولوں کے پہلے صفحات میں ہی سیکھ لیتا ہے کہ وہ اس دُنیا میں کھوج لگا رہا ہے

اور اگر وہ اس کے ساتھ نپٹنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایسا حیرانی کے بغیر کرتا ہے۔ ایسے ہی تضادات کے ذریعے بے سروپا کاموں کی پہچان کی جاتی ہے۔ ذہن اپنی روحانی ٹریجڈی کو ٹھوس پن میں پراجیکٹ کرتا ہے۔ وہ ایسا صرف دائمی پیراڈاکس کے ذریعے کر سکتا ہے جو ادراک کی قوت عطا کرتا ہے تاکہ خلاء کا اظہار کر سکے اور روز مرّہ کے کاموں کے ذریعے ابدی تراغیب کی شرح کر سکے۔

اسی طرز پر شاید "دی کاسل The Castle" میں بر سرِ پیکار الٰہیات ہے تاہم سب سے پہلے یہ روح کی انفرادی مہم ہے جو اپنی ہی عظمت کی تلاش ہے۔ ایک ایسا انسان جو اس دُنیا کی اشیاء اور عورتوں سے ان کے شاہانہ رازوں اور فطرت کے نشانات کے بارے میں استفسار کرتا ہے جو ان میں سو رہا ہے۔ کایا پلٹ وضاحتِ بیان کی اخلاقیات کے خوفناک تخیل کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ اس نا قابلِ شمار استعجاب کی پیداوار ہے جو انسان حیوان ہونے کے شعور پر محسوس کرتا ہے جو وہ بلا کوشش بن جاتا ہے۔ اس بُنیادی ابہام میں کافکا کے راز مُضمر ہیں۔ غیر معمولیت اور فطرت کے درمیان یہ دائمی چھلاوے اس کے پورے ناولوں اور افسانوں میں پائے جاتے ہیں اور اس کو معنی اور گونج فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ پیراڈاکس ہیں جن کو شمار کرنا چاہیے، وہ تضادات ہیں جن کو قوت بخشنی چاہیے تاکہ اس کے بے سروپا کام کو سمجھا جا سکے۔

ایک علامت دو کرّوں کو فرض کرتی ہے، خیالات اور محسوسات کی دو دُنیاؤں اور ان کے درمیان ملاپ کی فرہنگ کو فرض کرتی ہے۔ یہ فرہنگ بنانا سب سے مشکل کام ہے۔ لیکن دونوں دُنیاؤں کے آمنے سامنے بیداری ویسی ہی ہے جیسے ان کے خفیہ تعلقات کے سراغ کے پیچھے سفر باندھنا ہے۔ کافکا کے ناولوں میں ایک طرف یہ دونوں دُنیا روز مرّہ کے کاموں میں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف مافوق الفطرت بے قراری کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم نٹشے کے ریمارکس کا لامتناہی استحصال کر رہے ہیں: "عظیم کام ہی ہماری شاہراہ ہے۔"

انسانی حالت میں ایک بنیادی بے سروپائی ہے جس طرح اس میں بے رحم اشرافیہ ہوتی ہے۔فطرت کی طرح دونوں ہم زماں ہیں۔ دونوں ہمارے جسم کی عارضی خوشی اور روحانی بہتات کے درمیان بے سروپا جدائی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بے سروپا چیز یہ ہے کہ جسم کی روح ہونی چاہیے جس کو یہ خلافِ دستو ماورا کرتی ہے۔ جو بھی اس بے سروپائی کی نمائندگی کرے گا موازنے کے سلسلے کو جنم دے گا۔اسی طرح کافکا روزمرہ کے حوالے سے ٹریجڈی کا اظہار کرتا ہے اور منطقی طور پر بے سروپائی کو بیان کرتا ہے۔

ایک اداکار ٹریجک کردار ادا کرتے ہوئے قوت مُستعار لیتا ہے تاکہ مبالغہ آرائی سے گریز کر سکے۔اگر وہ اعتدال پسند ہے تو جس ہیبت سے متاثر ہوتا ہے وہ غیر اعتدال پسند ہوتی ہے۔اس لحاظ سے یونانی ٹریجڈی ماحاصل کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے۔کسی بھی الم ناک کام میں قسمت اپنے آپ کو بے تکلفی اور منطق کے روپ میں بہتر طور پر محسوس کرواتی ہے۔اوڈیپس کی قسمت کا پہلے سے ہی اعلان کر دیا جاتا ہے۔مافوق الفطرت کے لحاظ سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قتل کرے گا۔ڈرامے کی پوری کوشش منطقی نظام کو ظاہر کرتی ہے جو استخراج میں سے استخراج کرتا ہے اور ہیرو کی بدقسمتی پر تاج پہناتا ہے۔صرف یہ اعلان کرنا کہ غیر معمولی قسمت ہی خوفناک ہے خلافِ قیاس بات ہے۔اگر اس کی ضرورت کو روزمرّہ کی زندگی، سوسائٹی، ریاست، مانوس جذبات کے فریم ورک میں مظاہرہ کیا جائے تو ہیبت ناکی کھوکھلی ہوتی ہے۔ جو بغاوت انسان کو کھوکھلا کرتی ہے وہ یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔مایوس یقین کے عناصر بھی ہیں جو ہو سکتے ہیں۔

یونانی ٹریجڈی کا یہی راز ہے یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم اس کے پہلوؤں کا ایک پہلو ہے۔ایک اور پہلو بھی ہے جو معکوس طریقہ کار سے ہمیں کافکا کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔جو چیز بھی انسان کو کچل دیتی ہے اور اس کے بس میں نہیں ہوتی اس کو انسان قسمت کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔لیکن خوشی کا کوئی استدلال نہیں ہے کیونکہ یہ ناگزیر ہے۔ ماڈرن انسان اپنے لئے کریڈٹ لیتا ہے جب وہ اس کو پہچاننے میں ناکام نہیں ہوتا۔اس

کے برعکس یونانی ٹریجڈی کی استحقاقی قسمت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جن سورماؤں کی حمایت کی گئی تھی وہ الیسز (Ulysses) جیسے ہیں جو مہم جوئی کے وسط میں بچ جاتے ہیں۔ جس کے لئے واپس لوٹنا ممکن نہ تھا۔

جس بات کو یاد رکھنا چاہیے وہ خفیہ ساز باز ہے جو الیے کی روزمرّہ حالت اور منطق کو شامل کرتی ہے۔ اسی وجہ سے سمسا کا یا پلٹ کا ہیرو ایک سیلز مین ہے۔ اس مُہم جوئی میں جو چیز اسے پریشان کرتی ہے اور ضرر رساں کیڑے میں تبدیل کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا باس غیر حاضری پر ناراض ہوگا۔ اُس کی ٹانگیں اور محسوس کرنے والی مونچھیں نکل آتی ہیں، اس کے پیٹ پر سفید نشانات ظاہر ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا یا پلٹ سے اسے حیرانی نہیں ہوئی بلکہ اس سے اُسے کسی حد تک خفگی ہوئی۔ کافکا کا پورا کام ہی امتیازی ہے۔

OOO

افسانے
عصمت چغتائی

افسانے
کرشن چندر

افسانے
امرتا پریتم

افسانے
سعادت حسن منٹو

دیوداس

محبت کی عجیب کہانی

ماں

جہنم

فاؤسٹ

آقا

قلعہ

کاندید

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور پاکستان فون: 37245072